یادگار انیس

امیر احمد علوی۔ بی۔ اے

شائع کردہ

ہندوستان کتاب گھر لکھنؤ

مطبوعہ

سرفراز قومی پریس لکھنؤ

بار پنجم

قیمت ~~3.50~~

سنہ ۱۹۶۰ء

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

مرثیہ اور اُس کی عہد بہ عہد ترقی

مرثیہ کے لفظی معنی "وصفِ میت" ہیں اور اصطلاحِ شعرا میں مرثیہ اُس صنفِ سخن کو کہتے ہیں جس میں شخصِ متوفیٰ کے محامد و فضائل و سوانح درد و حسرت کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں۔

درد و غم کا جذبہ تمام جذباتِ انسانی سے قوی تر ہے۔ حسرت و مصیبت کی کہانی عیش و شادمانی کی داستان سے زیادہ باثر ہے۔ رنج و آلام سے متاثر ہونا فطرتِ انسانی کا خاصہ ہے۔ اس لیے مرثیہ کا اثر قصیدہ اور منقبت سے زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ ہر ایک مصرع دلوں پر نشتر چلاتا ہے اور ہر ایک شعر آہ و زاری کا مینھ برساتا ہے۔

یوں تو مرثیہ ہر ایک مصیبت اور تباہی پر کہا جا سکتا ہے حضرت داؤد کا مرثیہ طالوت کے قتل پر، دھرتراشٹر کا نوحہ کوروں کی تباہی پر۔ سہراب کی ماں کا ماتم بیٹے کے قتل پر۔ شیخ سعدی کا مرثیہ ملک مستعصم کے زوال پر۔ عجم کی تذلیل پر فردوسی کا ایک مصرع "تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو" اور دارا کی موت پر نظامی کا ایک شعر ؎

بسی نامۂ دولت کیقباد ورق بر ورق ہر سوئے برد باد

ہزار داستان حرمان و قلق کا خلاصہ ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں مرثیہ کا اطلاق زیادہ تر حضرت امام حسین علیہ السلام اور اُن کے رفقا کے احوال شہادت پر ہوتا ہے۔ یہ حسرتناک واقعہ اسقدر عبرت خیز ہے کہ اگر سادہ الفاظ میں بغیر کسی عبارت آرائی کے بیان کر دیا جائے تو بھی سننے والوں کے دل ہل جائیں اور "گریہ بر ملائک ہفت آسماں فتد" اللہ! اللہ کیسا دردانگیز منظر ہے کہ مسلمانوں کے نبی صلعم کا نواسہ حاکم وقت کے جبر و ظلم سے عاجز آکر اپنے وطن سے جدا ہو۔ رسول پاک کا مقدس جوار چھوڑے مکہ کو اقامت گاہ بنائے۔ وہاں بھی چین میسر نہ آئے۔ بعض گندم نما جو فروش حمایت و نصرت کا سبز باغ دکھا کر خانۂ خدا میں بھی ٹکنے نہ دیں۔ بیوفائی اور بدعہدی کوفیوں کا شیوہ ہے لیکن وہ کلمہ پڑھتے ہیں اور حجت حق ان کو مسلمان سمجھ کر عین موسم حج میں کعبہ سے کوچ فرماتے، ریگستان عرب کی گرمی اور سختی برداشت کرتے ہوئے اپنے کنبہ کی عورتوں اور بچوں کو ساتھ لیے عراق کی سرحد تک پہونچتے ہیں۔ ناگہاں خبر ملتی ہے کہ جن بے وفاؤں نے خط اور پیام بھیج بھیج کر بلایا تھا منحرف اور برگشتہ ہو گئے اور مہمان عزیز کے خیر مقدم کیلئے تلوار یں تیز ہو رہی ہیں۔ کوفہ کی عزیمت فسخ کی جاتی ہے اور قضائے الٰہی راستہ بھلا کر نینوا کی ہولناک سرزمین پر پہونچا دیتی ہے۔ دشمنوں کا ایک عظیم الشان لشکر پہونچتا ہے۔ ہر طرف کے راستے بند کر دیے جاتے ہیں نہر فرات کا پانی جس سے چرند و پرند تک سیراب ہوتے ہیں ساقی کوثر کے فرزند کو اس قصور میں نہیں دیا جاتا کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف ایک حاکم فاسق و فاجر کی بیعت کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔

ترسم کزیں گناہ شفیعان روز محشر ‏ ‏ ‏ دارند شرم کز گنہ خلق دم زنند

جاں نثاروں کی جمعیت نہایت قلیل ہے جن میں سے بیشتر اپنے ہی بھائی بھتیجے ہیں۔ مقابلہ پر شام کی کار آزمودہ اور آراستہ فوج ہے جس کی تعداد ہزاروں تک پہونچتی ہے۔ نتیجۂ جنگ میں شک و شبہہ کی گنجائش نہیں۔ اعوان و انصار۔ اعزہ و اقربا سب کی موت یقینی ہے۔ عورتوں کی اسیری اور بچوں کی یتیمی پیش نظر ہے لیکن اس کوہ عزم و استقلال کی ہمت میں فرق نہیں آتا۔ پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوتی۔ کھانا پانی بند ہے معصوم بچے پیاس کی تکلیف سے تڑپ رہے ہیں بنی فاطمہ پر تیسرا فاقہ ہے لیکن نانا کی اُمت کو ورطۂ ضلالت میں ڈالنا گوارا نہیں۔ فاسق کی بیعت پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ زبان میں تاثیر ہے کہ لب ہلائیں تو پتھروں سے چشمے جاری ہونے لگیں۔ دل میں قوت ہے کہ بہشت کی نعمتوں کی خواہش کریں تو فوراً رضوان جنت الوان نعمت لے کر حاضر ہو لیکن رضائے الٰہی پر صابر و شاکر ہیں۔ غلاموں کی محبت بیٹوں سے زیادہ ہے اس لئے دشمنوں کے حق میں دعائے بد نہیں فرماتے، اور نہ زبان مبارک کو کلمۂ شکایت سے آلودہ ہونے دیتے ہیں۔

اعزا اور انصار میں سے ہر ایک کی تمنا ہے کہ سب سے پہلے میں جگر گوشۂ رسول کا فدیہ بنوں۔ باپ کی خواہش ہے کہ سب سے پہلے میں سر کٹاؤں اور بیٹوں کا داغ نہ دیکھوں۔ بیٹے بھتیجے کہتے ہیں کہ جب تک ہم میں سے ایک بھی زندہ ہے آپ کو میدان جنگ میں نہ جانے دینگے ان کی شجاعت اور جوانمردی ضرب المثل ہے نیزہ بازی اور فنون حرب کے خوب خوب جوہر دکھاتے ہیں لیکن دشمنوں کے غول کے غول ایک ایک پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور بھائی بیٹے سب آنکھوں کے سامنے مارے جاتے

ہیں۔ حتّٰے کہ چھ مہینے کا بچہ جو تشنگی کی شدت سے خود ہی نیم جاں ہو رہا تھا آغوشِ مبارک ہی میں دشمنوں کے تیر کا شکار ہوتا ہے لیکن اس نازک وقت پر بھی رحمت غضب سے سبقت لے جاتی ہے۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ نہ شکوۂ ظلم زبان پر آتا ہے اور نہ دل یادِ خالق سے غافل ہوتا ہے آخر کار دشمن نرغہ کر کے اس صابر و شاکر کو بھی شہید کرتے ہیں سرِ مبارک نیزہ کی انی پر آویزاں کیا جاتا ہے ؎

آں سر کہ بود بر سرِ دوشِ نبی مدام　　یک نیزہ زدوشِ مخالف جدا ببیں

جسدِ اطہر گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال ہوتا ہے۔ خیمۂ فلک بارگاہ میں آگ لگائی جاتی ہے اہلِ حرم برہنہ سر اعدا کی قید میں گرفتار ہوتے ہیں۔ خاندان نبوت کا ایک چراغ جو بیماری کی شدت سے جنگ کے قابل نہ تھا زندہ اسیر ہوتا ہے اور طوق و زنجیر میں جکڑا ہوا اس لٹے ہوئے کاروان مدینہ کے ساتھ حاکم شام کے دربار میں حاضر کیا جاتا ہے ؎

از صاحبِ حرم چہ توقع کنند باز　　آں ناکساں کہ تیغ بہ صیدِ حرم زنند

دشمن اپنے مقتولین کی تجہیز و تکفین کرتے ہیں مگر محمدؐ کے نواسے کی لاش عرصہ تک میدانِ کربلا میں بے گور و کفن پڑی رہتی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ کیسا دردناک بیان ہے اور کس قدر حسرت بھری داستان! اگر اس عہد کا کوئی شاعر جس کا دل درد و غم سے لبریز ہوتا اس واقعہ کو نظم کرتا تو تمام دنیائے اسلام میں آگ لگ جاتی اور "قتلِ حسین" سچ مچ "مرگِ یزید"[1] بن جاتا۔ عرب میں مرثیہ گوئی کا عام رواج تھا اور ایام جاہلیت ہی میں یہ فن کافی ترقی کر چکا تھا۔ عبد المطلب جدِ رسول اللہ اور بعض

۱؎ قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے　؛؛　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

دیگر ناموروں کے مرثیے عربی لٹریچر میں اس وقت تک محفوظ ہیں۔ اور "حماسہ" میں ایک مستقل فصل "باب المراثی" کے عنوان سے موجود ہے۔ آفتاب رسالت کے ~~طلوع~~ غروب ہونے کے بعد بھی مرثیہ گوئی کو زوال نہیں آیا۔ حسانؓ بن ثابت مداح رسولؐ نے شہنشاہ کونین کی وفات پر ایسے مرثیے لکھے کہ ان کا ہر شعر مجسم سوز و گداز ہے۔ حضرت فاطمہ زہراؑ نے بھی اس سانحہ قیامت نما پر ایک دردناک مرثیہ کہا جس کے ایک شعر کا مضمون یہ تھا کہ "مجھ پر مصائب ایسے آ پڑے ہیں کہ یہ مصیبتیں دنوں پر گزرتیں تو وہ رات ہو جاتے" خلیفہ دوم نے اپنے بھائی کا مرثیہ اس عہد کے مشہور مرثیہ گو متمم بن نویرہ سے فرمائش کر کے لکھوایا لیکن افسوس کہ امام حسینؑ پر آنسو بہانے کی کسی کو ہمت نہ تھی اور کربلا کے محشر خیز ظلم پر کوئی مرثیہ ایسا تصنیف نہیں کیا گیا کہ زندہ رہتا۔

بنی امیہ کے جور و ستم نے تمام شعرا کی زبانیں بند کر دی تھیں۔ فرزدق نے ایک قصیدہ حضرت امام زین العابدینؑ کی شان میں لکھا جس کے ایک شعر کا یہ مضمون تھا کہ "حضرت نے لفظ لا (کلمۂ انکار) سوائے تشہد (اشہد ان لا الہ الا اللہ) کبھی زبان مبارک سے نہیں نکالا اور اگر تشہد لازمی نہ ہوتا تو آپ کی ہر ایک "نہیں" "ہاں" ہوتی۔" اور مجمع عام کے سامنے بڑے جوش سے حاکم وقت کو مخاطب کر کے کہا کہ "تو نہیں جانتا تو جان لے کہ یہ فاطمہؑ کے بیٹے ہیں اور ان کے جد پر انبیا کا سلسلہ ختم ہوا" بادشاہ نہایت ناراض ہوا اور شاعر کو قید کر دیا۔ اسی جباری کا نتیجہ تھا کہ اس زمانہ کے کسی مشہور شاعر نے واقعہ کربلا نظم کرنے کی جرأت نہیں کی اور عرب کی شاعری بیان مصائب اہل بیت کی سعادت سے محروم رہی۔ بنی عباس کے

عہد میں بعض غیر مشہور شعراء نے متفرق اشعار واقعہ کربلا کے متعلق کہے اور دعبل خزاعی نے ایک طویل مرثیہ لکھا جس کے شہرت کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ امام علی رضا علیہ السّلام کے حضور میں پڑھا گیا۔ لیکن اثر اور جوش کا اس میں پتہ نہیں بلکہ اسی زمانہ میں برامکہ کے قتل پر جو دردناک مرثیے کہے گئے تھے ان سے اس سرمایۂ ناز و افتخار دعبل کو کچھ نسبت نہیں۔

البتہ ایران کی مقدس سرزمین نے غلامی خاندان رسالت کا حق ادا کیا۔ جب اس ملک کو خودمختاری نصیب ہوئی اور اہلبیت کا نیاز مند شاہ طہماسپ صفوی سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے حکم دیا کہ شعراء کو ائمہ اہلبیت کی شان میں طبع آزمائی کرنا چاہیئے۔ دفتر ازل میں یہ شرف محتشم کاشی کے لئے محفوظ رکھا گیا تھا کہ وہ مصائب کربلا پر پہلی مرتبہ ایسے دردناک الفاظ میں نوحہ کرے کہ اس کے مرثیہ کو قبول عام اور بقاء دوام کی سند نصیب ہو اس نے چند بندوں کا ایک مرثیہ لکھا جو فطرتی جذبات سے لبریز اور درد و غم کی مجسّم تصویر ہے۔ اس کے کچھ شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:۔

(دختر زہرا امام زماں کے پیکر شریف کو خاک و خوں میں غلطاں دیکھکر مدینے کی طرف رُخ کرتی اور حضرت رسول عربی کے برزخ مبارک سے عرض کرتی ہیں)

پس با زبان پُر گلہ آں بضعۃ البتول
رو در مدینہ کرد کہ یا ایّہا الرسول

این کشتۂ فتادہ بہ ہاموں حسین تست — ویں صید دست و پا زدہ در خوں حسین تست
ایں غرقۂ محیط شہادت کہ روئے دشت — از موج خون او شدہ گلگوں حسین تست

ایں خشک لب فتادہ ممنوع از فرات — کز خون او زمیں شدہ جیحوں حسین تست
ایں شاہ کم سپاہ کہ با خیل اشک و آہ — خرگاہ ازیں جہاں زدہ بیروں حسین تست
ایں قالب طپاں کہ چنیں ماند بر زمیں — شاہ شہید ناشدہ مدفوں حسین تست

محتشم کے بعد مقبل نے مرثیہ گوئی میں شہرت پائی اور شوکت الفاظ کے زور سے ملا محتشم کی درد و تاثیر کا جواب دیا۔ فرماتے ہیں:۔

بلند مرتبہ شاہے زصدر زیں افتاد — اگر غلط نہ کنم عرش بر زمیں افتاد

انھوں نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ کربلا کے تمام واقعات ابتدائے سفر سے اہل حرم کے قید ہونے اور رہائی پاکر مدینے آنے تک نظم کر دیے۔

پھر تو ایران میں مرثیہ گویوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا اور سیکڑوں شاعر مرثیہ کہنے لگے۔ اب ہندوستان میں فارسی شاعری سے دلچسپی بہت کم باقی ہے اس لیے مرثیہ گویان ایران کے کلام پر تبصرہ بیکار ہے۔

ہمارے ملک میں اردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی اور مرثیہ گوئی کا آغاز بھی وہیں سے ہوا سلاطین بیجاپور و گولکنڈہ نے سرپرستی کی محمد قلی قطب شاہ (المتوفی ۱۰۲۲ھ) سلطان محمد قطب شاہ (المتوفی ۱۰۳۵ھ) اور عبداللہ قطب شاہ (المتوفی ۱۰۸۳ھ) بادشاہان گولکنڈہ خود شاعر اور سخن سنجوں کے جوہر شناس تھے انھوں نے فارسی آمیز دکنی اردو میں دواوین مرتب کیے۔ اس عہد کے شعرا میں نصرتی اور ہاشمی صاحب دیوان و قصائد تھے

لہ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

محمد قلی: سدا تو مدح نبی و علی کی کہتا ہے — معنی شعر ترا تو لکھے ہیں دست بدست

قطب شاہ: ہے محمد قطب شاہ بارہ اماموں کا غلام — ہیں سو عاجز داس ٹھہرایا علی سنج دستگیر
آیت قرآن نازل جیوں ہوا حضرت کے تئیں — مرتضیٰ ہیں بس دو جگ میں جیوں محمد بے نظیر

غواصی کی مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال ابھی تک مشہور رہی اور میرزان نامی ایک پاک طینت بزرگ تھے جو صرف مرثیے کہتے تھے۔ حمد و نعت و منقبت کے سوا اپنی زبان کو دوسری چیزوں سے آلودہ نہیں کیا۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کے کلام کا نمونہ موجود نہیں۔

گولکنڈہ کے آخری تاجدار ابوالحسن تانا شاہ شعر و سخن کے فریفتہ تھے اور ان کے مصاحبوں میں شاہ قلی خاں ایک مرثیہ گو شاعر تھے جن کے اشعار ہاتھوں ہاتھ دہلی اور آگرہ پہونچتے اور وہاں مجالس عزا میں پڑھے جاتے۔

اُن کی زبان کا نمونہ یہ ہے:۔

ملنا تھن غیر سے کوئی جھوٹ کوئی سچ مچ کہے
کس کس کا منھ موندوں سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

جب زمانہ نے گولکنڈہ کا ورق الٹ دیا تو سپہر سخنوری پر شمس الدین ولی کے عروج و اقبال کا ستارہ چمکا جن کو صاحب تذکرہ آبحیات نے نظم اردو کا باوا آدم قرار دیا ہے۔ اردو شاعری ان کے وقت سے سو برس

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۷)

سلطان محمد ۔ بکرید عہد آیا صلوٰۃ بر محمدؐ — آنند علم اجایا صلوٰۃ بر محمدؐ

قطب شاہ۔ انجانے میں جوانی گیا پند تا سنا — قرآن اور حدیث سوں ترکیب کر کلام

عبداللہ۔ داد کیا باتاں نبی کے صدقے پوچھے گا اگر — شاہ عبداللہ کو پوچھ آ کر کہی حاضر جواب

قطب شاہ سلہ اس کا سن تصنیف ۱۰۳۵ھ ہے:۔

برس یک ہزار ہور پنج تیس میں — کیا ختم یو نظم دن تیس میں

یہ اور

پہلے شروع ہو چکی تھی اور قریب قریب تمام اصناف سخن ریختہ میں آ چکے تھے لیکن زبان صاف نہ تھی وہ ولی کے دور میں اس رتبہ کو پہونچی کہ ان کا کلام ہمارے زمانہ میں بھی سمجھا جا سکتا ہے فرماتے ہیں :۔

دل ولی کا لے لیا دلّی نے چھین ۔ جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

اے ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق ۔ کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

ہاتف نے یوں دیا ہے مجھ کو ولی بشارت ۔ اسکی گلی میں جا تو مقصد شتاب ہوگا

انھوں نے شہدائے کربلا کے حالات میں ایک مثنوی لکھ کر صاف شدہ اردو میں مرثیہ گوئی کا بنیادی پتھر رکھا۔ مثنوی کے خاتمہ میں کہتے ہیں :۔

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال ۔ تھا گیارہ سو پہ اکتالیسواں سال ۱۱۴۱
کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول ۔ ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول

ولی کی پیرانہ سالی میں سودا و میر کا عنفوان شباب تھا محبان اہلبیت کو رُلانے اور مجالس ماتم میں گرمی پیدا کرنے کے لیے مرثیہ گوئی کی ضرورت تھی۔ ہر طبقہ کے شعراء توشۂ آخرت فراہم کرنے کے لئے نعت و منقبت کہتے اور ان میں سے بیشتر مرثیے بھی تصنیف کرتے۔ وہ چومصرعے کہے جاتے اور مجلسوں میں رونے رُلانے کے کام آتے تھے۔ سودا اور میر کے عروج سے پہلے مرثیہ کا خوب رواج ہو چکا تھا اپنے وقت کے مشہور مرثیہ گو میاں مسکین کا سودا نے شہر آشوب میں تذکرہ کیا ہے ؎

اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا ۔ پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں نہ

میر تقی نے بھی مرثیہ کہا لیکن وہ اس پایہ کا نہ تھا کہ شہنشاہ کے

دیوان میں شامل کیا جاتا۔
چند شعر لکھتا ہوں :۔

(۱)

دلوں پر محبوں کے حالت عجب ہے، مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے حسینِ علی کی شہادت کی شب ہے

(۲)

محبوں نے دل سے خوشی سب تجی ہو ہر اک گھر میں ماتم کی مجلس رچی ہو
عجب طرح کی وائے ویلا مچی ہے کہ روزِ قیامت کی گویا یہ شب ہو

(۳)

کوئی دل نہیں جس کو ماتم نہ ہوگا وہ دل دیر ہے جس میں یہ غم نہ ہوگا
یہ دن کچھ قیامت سے بھی کم نہ ہوگا قیامت میں یہ کچھ نہ ہوگا۔ جواب ہے

(۴)

ہے چاروں طرف ہو رہا شورِ محشر زمیں آسماں ہو رہا ہے تل اوپر
حسین علی پر چلایا ہے خنجر ہر اک جان اس غم سے خنجر طلب ہے

(۵)

بجا ہے کہ لوہو کے دریا بہائے یہ کشتی فلک کی لہو میں ڈبائے
شہِ تشنہ لب کا کسے غم سناتے یہ کس منھ سے کہئے کہ وہ تشنہ لب ہو

مرزا رفیع سودا نے اس کا رد لکھا۔ تمہید میں فرماتے ہیں :۔
"لیکن مشکل ترین دقائق طریقہ مرثیہ کا معلوم کیا کہ مضمون واحد کو ہزار رنگ میں ربط معنی دیا۔ اس کام میں محتشم سا کسو نے عز قبول نہیں پایا۔ پس لازم ہی کہ مرتبہ د نظر رکھ کر مرثیہ کہے

نہ کہ برائے گریۂ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے"۔
مگر جب خود مرثیہ کہنے بیٹھے تو اس زمین کو ذرا بھی بلند نہ کر سکے۔
ان کا بہترین مرثیہ یہ ہے:۔

(۱)

یارو سنو تو خالقِ اکبر کے واسطے — انصاف سے جناب وحیدر کے واسطے
وہ بوسہ گہ نبی بھی پیمبر کے واسطے — یا ظالموں کی برّشِ خنجر کے واسطے

(۲)

دیکھا جہاں میں کافر و دیندار کا بھی بیر — انکی سپاہ پر قساوتِ قلبی نہ کی ہیں سیر
پہنچے دیں آب النس سے لے تا بہ وحش و طیر — مانع ہوں ابن ساقیِ کوثر کے واسطے

(۳)

امت ہے وہ کہ خانۂ دیں کی ہو پاسبان — یا لوٹ لیوے اپنے پیمبر کا خاندان
آتش برائے بحث و ہر آئی بھی در جہاں — یا زینب کو وہ فاطمہ کے گھر کے واسطے

(۴)

راوی لکھے ہے خورد و کلاں سن میں جب ہوا — نیزے سے اور تیر سے سب کا لہو جدا
شش ماہہ طفل اصغرِ معصوم تک ہوا — طعمۂ عقابیِ تیرِ ستمگر کے واسطے

(۵)

تنہا پھر اس زمیں پہ رہا شاہِ کربلا — اسکا بھی تیغِ ظلم سے آخر کٹا گلا

لہ جنت مکان مرزا دبیر کا عجز و انکسار دیکھئے۔ کسی سوزخوان کی فرمائش سے اسی بحر میں مربع مرثیہ کہا تو مقطع میں سودا کے فضل و تقدم کا اعتراف کیا فرماتے ہیں:۔

بس اے دبیر سینہ ہے بریاں جگر کباب — سودا کے مرثیے کا تو ممکن نہیں جواب
بر فضلِ حق سے مرثیہ یہ بھی ہے انتخاب — کافی ہے مجھ کو بخششِ محشر کے واسطے

بعد اس رستم کے خیمہ ہوا موردِ بلا   غارتگروں کے ہاتھ سے زیور کے واسطے

(۶)

یا مرتضیٰ علی ولی حشر کا قیام   جس روز ہو عوض لیئے لکھے ہے یہ غلام
سودا کو بھولیو نہ تو اپنے زفیض عام   دریائے العطش کے شناور کے واسطے

سودا نے خداوند سخن کو ہدف ملامت بنایا لیکن خود بے تکلف مرثیوں میں غلط الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ نہ صفائی بندش کا لحاظ ہے نہ "مرثیہ در نظر" اور نہ مضامین میں نو بنو کی تلاش۔ ملاحظہ ہو :-

کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی   جو ہے دنیا میں سو کہتا ہے مجھے ایذا دی
ہاتھ سے کون نہیں آج ترے فریادی   یاں تلک پہونچی ہے ملعون تری بیدادی
کون فرزند علی پر یہ ستم کرتا ہے
کیوں مکافات سے اس کے تو نہیں ڈرتا ہے

خویش و فرزند و عزیز اسکے تھے جتنے پیارے   دشنہ و تیغ سے ہیں ظالموں کے سب مارے
اہلبیت اسکے جو باقی ہیں سو ہیں آوارے   قید میں کوفیوں کے جاتے ہیں وہ بیچارے
نہ انھیں چین ہے دن کو نہ انھیں رات آرام
اس مصیبت میں چلے جاتے ہیں کربل سے شام

یہ مرثیہ مسدس ہے حالانکہ اس سے پہلے مرثیے چو مصرعے ہوا کرتے تھے معلوم نہیں ٹیپ لگانے کی جدت مرزا ہی کو سوجھی یا یہ شرف میاں سکندر کو نصیب ہوا جو پنجاب کے رہنے والے مرزا کے ہم عصر تھے اور تلاش معاش میں لکھنؤ آ بسے تھے۔ انھوں نے ایک نہایت دردناک مرثیہ مسدس کے طرز کہا جو آج تک مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے اور یقیناً اردو زبان میں پہلا مسدس ہے[1]

[1] بعض حضرات کا خیال ہے کہ اردو میں پہلا مسدس حیدر شاہ نامی ایک شاعر نے کہا تھا

جس کو قبول عام کی سند ملی۔ سودا کا مرثیہ ان کے دیوان میں مقید ہے اور سکندر کا مرثیہ نواح لکھنؤ میں سو برس کے بعد بھی بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

شیر دلان پنجاب فخر کریں کہ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا دوسرا دور ان کے ایک ہم وطن کے کلام سے شروع ہوتا ہے اور جس عالیشان عمارت کو شعرائے لکھنؤ نے "تا بہ ثریا" پہونچایا اس کی داغ بیل میاں سکندر ہی کی ڈالی ہوئی تھی!! اس مقبول مرثیہ کے چند بند یہاں نقل کئے جاتے ہیں:۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷) جنھوں نے احمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں وفات پائی اور مندرجہ ذیل بند اُن کا کلام بتایا جاتا ہے:۔

عزیزو آج ناموس نبی پر آفت آئی ہے — شب رخصت ہے بہنوں سے شہ دیں کی جدائی ہے
خصوصاً بی بی بانو نے عجب حالت بنائی ہے — سرہانے بی سکینہ کے کھڑی دیتی دہائی ہے
منھ اُسکا چومتی ہے اور یہی کہہ کے روتی ہے
اری اُٹھ لاڈلی میری غضب کی صبح ہوتی ہے

لیکن یہ ایسا بہتان عظیم ہے کہ اسکی تردید کیلئے نقلی دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ محمد شاہ اور احمد شاہ کے وقت میں اُردو زبان کی جو حالت تھی اسکا نمونہ ان اوراق میں پیش کیا جا چکا ہے ولی۔ میر تقی۔ مرزا رفیع سودا اور اُنکے ہمعصروں کی زبان کا نمونہ اُردو لٹریچر میں بکثرت موجود ہے۔ ممکن ہے کہ حیدر شاہ کوئی مرثیہ گو شاعر عہد احمد شاہ میں ہوں لیکن یہ بند اُنکے کلام کا نمونہ ہرگز نہیں ہو سکتا اسکی زبان بہت صاف اور شستہ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ متاخرین میں سے کسی غیر مشہور شاعر کی تصنیف ہے اگر بفرض محال یہ بند احمد شاہ کے عہد میں کہا بھی گیا ہو تو ثابت نہیں ہوتا کہ حیدر شاہ نے کوئی طویل مرثیہ اس طرز میں تصنیف کیا تھا یا صرف یہی بند اُنکا سرمایۂ ناز ہے علاوہ اس کے میاں سکندر کا فضل تقدم اس شہادت سے ساقط نہیں ہو سکتا کیونکہ سودا کے مسدس کی طرح یہ بند بھی گارسن ڈی ٹاسی کے تذکرہ شعرا میں بند ہے قبولیت عام سکندر کے مرثیے سے پہلے کسی مسدس کو نصیب نہیں ہوئی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ۔

ہے روایت شتر اسوار کسی کا بخدا رسول — اک جگہ شہر مدینہ میں ہوا اسکا نزول
جس محلے میں کہ رہتے تھے حسین ابن بتول — ایک لڑکی کھڑی دروازے پر بیمار و ملول

خط لئے کہتی تھی پردے سے لگی زار و نزار
ادھر آ تجھ کو خدا کی قسم اے ناقہ سوار

ناگہاں سن شتر اسوار وہ آواز حزیں — باادب آن کے کہنے لگا پردے کے قریں
کوئی اس گھر میں دلاسے کو ترے ہے کہ نہیں — اتنی سی عمر میں کیا دکھ ہے کہ تو ہے غمگیں

کون سی قوم کی لڑکی ہے تو بیمار صغیر
کیا ترا نام ہے اور کس کے لئے ہے دلگیر

وہ لگی کہنے کہ سن بندۂ حی القیوم — میرا نانا ہے نبیؐ دادا علیؓ باب علوم
یہ محلہ بنی ہاشم کا ہے سب پر معلوم — اور میں لڑکی جو بیمار ہوں دکھیا مغموم

فاطمہ صغریٰ اسی واسطے ہے میرا نام
دادی زہراؓ کی سی صورت ہے مرے منھ کی تمام

اور چچا میرا حسنؓ زہر سے جس کو مارا — بعد اسکے کوئی اس ڈیرے کا والی نہ رہا
ایک جیتا جو رہا میرا حسینا بابا — وہ بھی بیمار مجھے چھوڑ سفر کو ہے گیا

اب تلک اسکی خبر مجھ کو نہیں ہے معلوم
ام سلمہؓ مری اک نانی ہیں گھر میں مغموم

ایک تو فاقہ کشی دوسرے میں ہوں بیمار — گھر میں دانہ نہیں کیا تجھ سے کہوں ناقہ سوار
ایک مقنع ہی مرے سر پہ سو دیتی ہوں اتار — میں نے بخشا تجھے کھائی مرا خط لیکے سدھار

کہیو بابا سے کہ ہے فاطمہ صغریٰ بے چین
نام لے لیکے وہ مر جائیگی کہہ کہہ کے حسینؑ

اس لئے نامہ دیتی ہوں تجھے اے ناقہ سوار — کربلا کی مجھے بو آتی ہے تجھ سے ہر بار

میرا بابا بھی گیا ہے گا اُدھر ہو لاچار — گر کہیں ہے تر اُس دشت کے میداں میں گزار
کہیو رو رو کے زبانی مرا یہ سب سے پیام
بندگی میری بڑوں کو میرا چھوٹوں کو سلام

میری ماں بانو سے کہیو کہ تم اتنا کہیو — میری جانب سے سکینہ کی بلائیں لیجو
اور مری پھوپھیوں سے تم رو رو کے یہ کہہ دیجو — کھانا دان کھاؤ تو قرآن کے پانی پیجو
بھائی اکبر سے یہ کہیو کہ وطن کو جاؤ
پھیر بابا کو مدینے کی طرف لے جاؤ

یہ پیام اپنا سنا فاطمہ صغرےٰ بی بی — خط و مقنع شتر اسوار کو جو دینے لگی
اس نے مقنع نہ لیا رو کے کتابت لے لی — وقت رخصت کے کہا بی بی نے مت رو بھائی
جگ میں روتا ہوا قاصد جو کہیں جاتا ہے
پھر مقرر وہ موے کی ہی خبر لاتا ہے

سن کے خاموش ہو منہ پھیر کے وہ ناقہ سوار — ہانکتا اونٹ چلا چھوڑ مدینے کا دیار
جس طرف دیکھتا جنگل میں کہ اٹھتا ہے غبار — دوڑ کر پوچھتا ہر ایک مسافر کو پکار
لشکر ابن علیؑ سے جو کوئی ہو آگاہ
مجھ کو بتلاوے نشان اسکا برائے اللہ

التماس اب ہے سکندر کی یا اللہ — میرے مکتوب سے یوں طول امل ہوں کوتاہ
نہ رہے جس کی سطر میں کہیں اک حرف گناہ — واسطہ فاطمہ صغریٰ کا ہو بخشش کی نگاہ
آب رحمت سے مرے جرم کا نامہ دھو ڈال
ہو نہ شبیرؑ کی خاطر سے یہ منظور سوال

اس مرثیہ کا سال تصنیف معلوم نہیں لیکن سودا کا سال وفات ۱۱۹۵ھ ہے میاں سکندر مرزا رفیع کے ہم عصر تھے اس لیے یہ جدت غالباً ۱۱۹۵ھ سے

پہلے کی ہے اس کے تقریباً بیس سال بعد سید انشا کا عروج ہوا "دہ دریائے لطافت" میں لکھتے ہیں کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" ہوتا ہے۔" اس وقت تک مرثیہ خوانی کے پیشے کو لوگ حقارت سے دیکھتے تھے مگر سلطنت کا مذہب شیعہ تھا، امرا، اور داعیان ریاست اسی مشرب کے حلقہ بگوش تھے۔ عشق اہل بیت لکھنؤ کی خاک پاک میں سرایت کر گیا تھا۔ مجالس عزا دھوم دھام سے ہوتی تھیں۔ اہل ایمان آرزو کرتے تھے کہ اُن کے مذہبی جلسوں میں مشاعروں سے زیادہ رونق پیدا ہو۔ مرثیوں میں صحیح الفاظ ادا کیے جائیں اور شعرا اپنا زور طبیعت سرمایۂ آخرت پر صرف کریں۔ اہل کرم کی داد و دہش نے مرثیہ گویوں کی ہمت افزائی کی اور چند ہی روز میں ایک کامل پیدا ہوا جس نے عاشقانہ شاعری سے دست بردار ہو کر مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی شروع کی یہ بزرگ مرزا دبیر کے استاد میر ضمیر تھے۔ دلگیر، میر فصیح اور میر خلیق نے بھی اسی صنف میں کمال حاصل کیا اور بادشاہ غازی الدین حیدر کے عہد میں یہ فن اس قدر ترقی کر چکا تھا کہ مرزا رجب علی سرور نے اپنے فسانہ عجائب میں اہل لکھنؤ کے کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے مرثیہ گویوں کی طرف بھی اشارہ کیا اور تمام مرثیہ گویوں کے نام بتا دیے جو اس وقت موجود تھے یا اس سے پہلے اس فن میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔

"مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر۔ صاف باطن نیک ضمیر۔ خلیق۔ فصیح۔ مرد مسکین۔ مگر دہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب۔ دبیر مرغوب۔ سکندر طابع۔ بصورت گدا بار احسان اہل دول کا نہ اٹھایا عرصۂ قلیل میں مرثیہ و سلام کا دیوان کثیر فرمایا۔"

سرور نے یہ عبارت میاں دلگیر کی مدح میں لکھی ہے جس سے ثابت

ہوتا ہے کہ وہ دلگیرؔ ہی کے دلدادہ تھے۔ اس وقت کے بیشتر اہل کمال دلگیر
سے محبت کرتے تھے۔ شیخ ناسخ لکھنؤ سے جدا ہوئے تو دلگیر کو یوں یاد کرتے ہیں

متحد ایسے زمانہ میں کہاں ہوتے ہیں — آپ دلگیر ہے ناسخ جو ہے دلگیر جدا

میاں دلگیر کے کلام میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے نمونہ کے طور پر
چند بند لکھے جاتے ہیں:-

شہید ظلم جو وہ شاہ تشنہ کام ہوا — بہ نوکِ نیزہ علم تب سرِ امام ہوا
حرم سرا میں لعینوں کا اژدحام ہوا — خیامِ شاہ میں انبوہ فوجِ شام ہوا
حرم کا زیور و زر لوٹنے لگے ظالم
حسین امام کا گھر لوٹنے لگے ظالم

جو شہربانو تھی شہزادی دیارِ عجم — عزیز رکھتے تھے جسکو بہت امامِ امم
رکھا تھا صحن میں جس نے نہ تا بہ عمر قدم — بڑی تھی جس کے نہ منھ پر نگاہ نامحرم
سو روزِ بد تھا یہ اس معدنِ حیا کے لئے
ستم کی فوج میں محتاج تھی ردا کے لئے

ہوئی یہ خانۂ آلِ عبا کی بربادی — کہ سر برہنہ ہوئی ایک اک نبی زادی
ستمگروں نے یہ آلِ نبی کو ایذا دی — کہ بنتِ فاطمہ تھیں سر برہنہ فریادی
جلا جو خیمہ تو چھپنے کو کوئی جا نہ رہی
جنابِ زینبؑ خاتون کی ردا نہ رہی

جب آیا تیغ بکف خیمہ گہ میں شمرِ شقی — سکینہ گود میں اپنی پھوپھی کے جاکے چھپی
سر اپنا پیٹ کے وہ دلجلی یہ کہنے لگی — کوئی پدر کو مرے اب بلا دو جلدی
کبھی وہ چھوٹے سے ہاتھوں سے منھ چھپاتی تھی
کبھی وہ بید سی دہشت سے تھرتھراتی تھی

سرہانے عابدِ مضطر کے آئی فوج شریر
کوئی تو نیزہ دکھاتا تھا اور کوئی شمشیر
سب اپنی اپنی لگے کرنے اشقیا تدبیر
کوئی تو طوق و رسن لایا اور کوئی زنجیر

نہ ہاتھ ظلم کا اس دل کباب سے کھینچا
پکڑ کے ہاتھ اُسے فرشِ خواب سے کھینچا

غرض جو خیمۂ عصمت جلا چکے ظالم
اور اُنکی قید میں بھی پھنس چکے سب اہلِ حرم
تمام دفن ہوئے لاشہائے اہلِ ستم
پڑا زمیں پہ رہا لاشۂ امامِ اُمم

نہ کوچ فوج نے اُس دم بسوئے شام کیا
قریبِ مقتلِ شبیر کے مقام کیا

بٹھایا شب کو اسیروں کو اک درخت تلے
زمیں پہ بیبیاں بیٹھی تھیں منہ پہ خاک ملے
سکینہ روتی تھی لگ لگ کے اپنی ماں کے گلے
پڑا ئے قید میں جو ہوں بس اُنکا خاک چلے

اندھیری شب میں کہاں چوکی دینے والا تھا
ستم زدوں کا نگہبان حق تعالےٰ تھا

وہ سُونا دشتِ وہ میدان کی شب کی تاری
جو دیکھی زینبِ بیکس نے بیقراری کی
تباہ ہوگئی حالت علی کی پیاری کی
یہ بات اس نے ہر اک سے بہ آہ و زاری کی

کوئی بھتیجا نہ بیٹا نہ کوئی بھائی ہے
عجب طرح کی یہ رات ہم پہ آج آئی ہے

غرض کہ رات مصیبت کی ہوگئی جو تمام
تو کوچ پر ہوئے آمادہ سب وہ ساکنِ شام
برہنہ اونٹوں پہ اہلِ حرم بٹھائے تمام
بسوئے شام روانہ ہوئے وہ بد انجام

اب آگے کیا کہے دلگیر کیسی آفت تھی
پہنچ کے شام میں زینب پہ جو مصیبت تھی

اسی زمانے کے قریب میر ضمیر نے وہ مشہور مرثیہ کہا تھا جس کا مطلع ہے

جب پیاس آب تیر سے اصغر بجھا چکے
بچپن میں اپنا داغ پدر کو دکھا چکے
آغوش قبر میں اُسے حضرت سلا چکے
بانو کا لال خاک کے اندر چھپا چکے
کہتے تھے اب قریب ہی رحلت حسین کی
اے خاک ہے یہ چاند امانت حسین کی

اس مرثیہ کے چند بند سنئے تو ضمیر اور دلگیر کی زبان اور طرز بیان کا فرق صاف ظاہر ہو۔

ناگاہ سامنے سے نمایاں ہوا غبار
سمت مدینہ سے ہوا پیدا اشتر سوار
اک نامہ اُسکے سر پہ بندھا ہی با فتخار
ہر سمت دیکھتا ہوا آتا ہے بار بار
کہتا ہے یا خدا مری محنت قبول ہو
مہمان کربلا کی زیارت حصول ہو

پہونچا جو قتل گاہ میں تو دیکھتا ہے کیا
لاشے پڑے ہوئے ہیں جوانوں کے جا بجا
ہے اک طرف کو خیمۂ ویراں کھڑا ہوا
ہیں اک طرف سوار و پیادے ہزار ہا
پرچم کھلے ہوئے ہیں نشاں سر بہ اوج ہے
اور اسطرف علم ہے نہ لشکر نہ فوج ہے

اک سو تو العطش کی صدا ہے بہ القتال
اور اک طرف کو پانی بہاتے ہیں بدخصال
لاشوں پہ بیکسی ہے برستی پڑی کمال
کتنے ضعیف کتنے جوان کتنے خورسال
زخم جگر پہ ہاتھ کسی کا دھرا ہوا
دست بریدہ میں کہیں کنگنا بندھا ہوا

آیا اسی طرف کو یہ قاصد صفوں کو چیر
کھولے علم کھڑا تھا جہاں لشکر شریر
حیران کار ہو کے پکارا وہ مرد پیر
ہاں صاحبان خیل و حشم ایکم امیر
اس قافلہ کا قافلہ سالار کون ہے

اے صاحبو بتاؤ کہ سردار کون ہے

لوگوں نے ابن سعد کا اس کو پتا دیا — دیکھا بزیر چتر مرصع ہے وہ کھڑا
پاؤں سے سر تلک اسے دیکھا تو یہ کہا — افسوس ہے کہ دل کو نہ واشد ہوئی ذرا
یزید ہے اور امام ہے صاحب جمال ہے
میں اُسکو پوچھتا ہوں جو زہرا کا لال ہے

اُس نامہ بر سے کہنے لگی فوج نابکار — جا اس طرف کھڑا ہے بلندی پہ جو سوار
آیا یہاں تو پائے شتر ماندہ ایک بار — بس چڑھ گیا بلندی کے اوپر بحال زار
دیکھا غموں سے وارد اندوہ ہے حسین
گویا کہ آفتاب بسر کوہ ہے حسین

عالم ہے غش کا سینہ کے اوپر جھکا ہے سر — ہے خون کا خضاب لگا ریش پاک پر
عمامۂ رسولؐ خدا ہے لہو میں تر — رخساروں سے ہے نور ولایت کا جلوہ گر
زخمی تمام ناخن سے لے تا بہ فرق ہیں
گھوڑے سمیت خون کے دریا میں غرق ہیں

اس نے ٹھہر کے سبط نبی کو کیا سلام — ہاتھوں پہ رکھ کے نامہ کو لایا سوئے امام
شہ نے کہا کہ کون ہے بھائی تو نیک نام — بیکس کو یوں سلام جو کرتا ہے اس مقام
اس خط سے رُوح کچھ مری لذت اُٹھاتی ہے
تجھ سے تو بوئے اہل وطن مجھ کو آتی ہے

اس نے کہا مدینے کو اک روز میں گیا — سوئے محلہ بنی ہاشم گزر ہوا
اک دختر مریض کو واں دیکھتا ہوں کیا — سر پہ قصابہ ہاتھ میں تھامے ہوئے عصا
پردے سے یوں لگی ہوئی کر رہی کلام ہے
بھائی خدا کی راہ میں درپیش کام ہے

فریاد اس کی کر گئی دل پر مرے اثر
پوچھا جو اسکے حال کو ڈیوڑھی پہ آن کر
بولی کہ ہوں میں قوم کی سیدانی نوحہ گر
پڑ رہے کئی مہینے سے تپ اور درد سر
اور یہ محلہ ہاشمیوں کا تمام ہے
دادی بتول جد مرا خیر الانام ہے

بیٹی حسین کی ہوں یہ سب جانتے ہیں آہ
بابا مرا سفر کو گیا ہے بعزّ و جاہ
مجھ کو اکیلے گھر میں گیا چھوڑ کر تباہ
قاصد بھی کوئی آتا نہیں دیکھتی ہوں راہ
تو کربلا میں لے کے جو اس خط کو جائے گا
محشر میں فاطمہ سے صلہ اس کا پائے گا

شہ نے کہا کہ بس نہ زباں سے سنا پیام
خط کر کے چاک پڑھنے لگے شاہ تشنہ کام
لیتے تھے ہر مقام کے اوپر جگر کو تھام
پہنچے جب اس جگہ پہ تو رونے بہت امام
چھٹنے سے مفارقت میں جو یوں نہیں گزر گئی
شُنیو اکیلے گھر میں وہ ٹکرا کے مر گئی

قاصد سے تب کہا شہ دیں نے کہ جو سوال
تجھ سے نہ دیکھا جائے گا میرا مآل کار
گر وہ کہے کہ مجھ کو ملے شاہ نامدار
کر دیجیو فقط اسی کلمہ پہ اختصار
برباد کر چکے تھے لعین گھر حسین کا
جب میں چلا تو کاٹ لیا سر حسین کا

قاصد تو سوئے شہر مدینہ ہوا روال
سامان قتل سبط پیمبر ہوا یہاں
خاموش اے ضمیر نہیں طاقت بیاں
اہل زمیں بھی روتے ہیں اور اہل آسماں
مطلب نہ مدح سے نہ غرض واہ واہ سے
گزرے یہ مرثیہ شہ دیں کی نگاہ سے

فسانہ عجائب کی تکمیل سے بادشاہ نصیر الدین حیدر[1] کے عہد میں
فراغت ہوئی جن کا سال جلوس ۱۲۴۳ھ ہے۔ اُس وقت دلگیر، ضمیر، خلیق ہم پلہ
سمجھے جاتے تھے۔ مرثیہ گویوں کی توجہ بین پر تھی۔ مرثیوں کے بند ۱۲ سے لیکر
۳۵ یا ۵۰ تک ہوتے تھے اور بیشتر مرثیے سوز خوان ہی پڑھتے تھے۔

میر ضمیر نے روایتیں نظم کرنا شروع کیں تو مرثیہ ۵۰ بندوں سے
بڑھ کر ستر اسی بند کا ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ تعداد سو سے بھی متجاوز ہوئی
۱۲۴۹ھ میں ضمیر نے رزم و سراپا بھی مرثیوں میں داخل کیا اور اس میں
زمین کو آسمان بنا دیا۔ انھوں نے شہزادہ علی اکبر کی شہادت کے بیان میں
ایک مرثیہ ۱۰۱ بند کا کہا جس کا مطلع ہے:۔

کس نور کی محفل میں مری جلوہ گری ہے کس نور سے پُر نور یہ نورِ نظری ہے
آمد ہی میں حیران قیاس بشری ہے یہ کون سی تصویر تجلی سے بھری ہے
گو حسن کا رتبہ نہیں مذکور ہوا ہے
منبر مرا ہم مرتبۂ طور ہوا ہے

اس میں تمہید سے چہرہ باندھا۔ پھر سراپا لکھا جو مرثیہ میں شعرائے سابق
نے شامل نہیں کیا تھا۔

قرآن کی تشبیہ یہ اس دل نے بتائی پیشانی انور ہے کہ ہے لوح طلائی
ابرو سے وہ بسم اللہ قرآن نظر آئی جب دل کشش زلف کی تا ردلے دکھائی
وہ زلف وہ یعنی الف لام رقم ہے
پر میم دہن مل کے یہ اک شکل الم ہے

---

[1] سنہ زر:۔
تا ابد قائم رہے فرمانروائے لکھنؤ یہ نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ

دیکھو کہ صفا ہے رخِ اکبر سے نمایاں — یاں سعی میں ہر دم ہے دلِ زینب نالاں
کعبہ جو سیہ پوش ہے اے صاحبِ عرفاں — یاں بھی رخِ انور پہ ہیں گیسوئے پریشاں

اس زلف میں پابند دلِ شاہِ اُمم ہے
زنجیر ہیں کعبہ کی یہ قندیلِ حرم ہے

مانند دعائے سحری قدِ رسا ہے — ماتھا ہے کہ دیباچۂ انوارِ خدا ہے
دو زلف نے اک چاند سا منھ گھیر لیا ہے — وصلِ شبِ قدر و شبِ معراج ہوا ہے

دو زلفیں ہیں رخسارِ دل افروز بھی دو ہیں
یاں شام بھی دو ہیں بخدا روز بھی دو ہیں

پھر میدان جنگ کا نقشہ دکھایا:-

تھا آب دمِ تیغ سے طوفان کا اسباب — تھی موج فنا سر سے گزرتا تھا پڑا آب
دریا تھا وہ لشکر تو ہر اک حلقہ تھا گرداب — اعضائے بریدہ صفتِ ماہی بے آب

آب دمِ خنجر پہ علمداروں کے دم تھے
جب تیغ علم کی تو علم صاف قلم تھے

اور بیانِ شہادت پر خاتمہ کر دیا۔ مقطع میں فرماتے ہیں:-

جس سال لکھے وصف یہ ہمشکل نبی کے — ۱۲۴۹ھ بارہ سو انچاس تھے ہجر نبوی کے
آگے تو یہ انداز سُنے تھے نہ کسی کے — اب سب پہ مقلد ہوئے اس طرزِ نوی کے

دس میں کہوں سو میں کہوں یہ درد ہے میرا
اس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا

افسوس ہے رزم کا بیان مرثیوں میں اس وقت شامل کیا گیا جب اہلِ ہند کو فوج کشی، صف آرائی اور قلعہ شکنی سے تعلق باقی نہیں رہا تھا شب و روز عیش پرستی سے سروکار تھا اور بجز افسانہائے بزم کے کسی اور چرچے ہیں

دل نہیں لگتا تھا۔

مجالس عزا کی برکت تھی یا میر ضمیرؔ کے صدق و خلوص کا ثمرہ کہ وہ میدان جنگ کی ہولناک تصویر دکھانے قتل و خونریزی کا نقشہ کھینچنے میں کامیاب ہوئے اور خلائق نے ان کی لطافت بیان پر تحسین و آفریں کے پھول برسائے۔ انھوں نے پہلی بار نظم اُردو کو تصویر رزم سے آشنا کیا گویا کہ سنگ مرمر کی ایک خوبصورت بارہ دری بنائی جس پر جواہرات کی پچی کاری کرنا اور طلائی نقش و نگار بنانا آیندہ نسل کے لئے محفوظ تھا۔ اہل فارس قصیدہ کو (۱) تشبیب (۲) گریز (۳) مدح (۴) دعا اور (۵) عرض حال پر مشتمل رکھتے تھے۔ انھوں نے مرثیوں میں (۱) چہرہ (۲) رخصت (۳) سراپا (۴) آمد (۵) رجز (۶) لڑائی (۷) بیان شہادت اور (۸) دعا لازمی قرار دے کر ۱۲۴۹ھ سے مرثیہ گوئی کے تیسرے دور کا آغاز کیا۔ میر ضمیرؔ نے مرثیہ میں جو جدتیں کیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) رزمیہ لکھا۔

(۲) سراپا شامل کیا۔

(۳) گھوڑے، تلوار اور اسلحۂ جنگ کے اوصاف لکھے۔

(۴) صفائی بندش پر توجّہ کی۔

(۵) غلط الفاظ جو مرثیوں میں بے تکلف استعمال ہوتے تھے ترک کر دیئے۔

(۶) تحت لفظ پڑھنے کا رواج دیا اور منبر پر ہاتھ اور اشارات چشم و ابرو سے بتانا شروع کیا۔

پہلے سب سے بہتر مرثیہ گو وہ سمجھا جاتا تھا جس کو مصیبت کے موقعوں کے روزمرّے کثرت سے معلوم ہوں اور ان کو مناسب طریقہ سے

استعمال کر سکے۔ میر خلیق۔ میاں دلگیر۔ مرزا فصیح۔ ضمیر کے ہم رتبہ تھے، بلکہ محاورہ بندی میں خلیق کا درجہ بلند تھا مگر اس طرز جدید نے سب کا بازار سرد کر دیا۔

میاں دلگیر کی زبان میں لکنت تھی۔ وہ خود مرثیہ نہیں پڑھتے تھے۔ ان کا کلام سوز خوان پڑھا کرتے تھے۔ سوز کے لئے بیّن مناسب تھا۔ وہ اپنی وضع پر قائم رہے اور ضمیر کی تقلید نہیں کی۔

میر خلیق کا جوہر کمال لطف زبان کو خیالات دردانگیز کے ساتھ ترکیب دیکر اہل مجلس کو رولاتا تھا۔ وہ مرثیت کے کوچہ سے قدم آگے بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے ضمیر کی تقلید اپنے کمالات میں موجب افزائش نہ سمجھ کر رزمیہ مضامین سے احتراز کیا اور صرف درد و تاثیر کی نعمت سے حریفوں کا مقابلہ کرتے رہے۔

فصیح نے "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" پر عمل کیا اور بیان رزم مرثیوں میں شامل کرنے لگے۔ مگر چند ہی روز کے بعد حج و زیارات کو تشریف لے گئے اور وہیں اقامت اختیار کر لی۔ مشق سخن وہاں بھی جاری تھی ان کا ایک نہایت پُر زور سلام مکہ سے آیا اور لکھنؤ میں ایسا مقبول ہوا کہ آج تک اہل دل کو اس کے اشعار حفظ ہیں۔ نمونے کے طور پر چند شعر اس سلام کے درج کیے جاتے ہیں۔

سلام لکھتا ہوں میں حرم میں قلم سے زمزم ٹپک رہا ہے
سرا اپنا کعبہ کے سنگ در پر سیاہ پردہ پٹک رہا ہے
گھرے ہیں بادل سے شام کے دل پہنچی ہی حیدر کی سیف بُرّاں
گھٹا میں بجلی چمک رہی ہے زمانہ آنکھیں جھپک رہا ہے

سکینہ پیاسی تڑپ رہی ہے پڑی ہے بیہوش بنت مسلم
ادھر کو اصغر سسک رہا ہے اُدھر کو باقر بلک رہا ہے

کہا یہ عابد نے ماں سے رو کر بچے نہ اصغر رہا میں زندہ
لگا گلے پر جو تیر اُن کے جگر میں میرے کھٹک رہا ہے

خدا مظفر حسین خاں کو بخیر و خوبی حرم میں لائے
فصیح مشتاق اس قدر ہے کہ راہ دن رات تک رہا ہے

میر ضمیر کے نامور شاگرد مرزا دبیر عرصہ سے مرثیہ گوئی کی مشق کر رہے تھے انھوں نے استاد کی پیروی میں شہزادہ علی اکبر کے حال کا مرثیہ طرز جدید میں لکھا اور مطلع بھی اسی شان کا کہا ع سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل۔ جس مجلس میں یہ مرثیہ پڑھا گیا اس میں خواجہ آتش بھی تشریف فرما تھے جب گھوڑے کی تعریف میں حسب ذیل بند مرزا صاحب نے پڑھا۔

وہ رخش تھا یا ابلق ایام کا اقبال ‏ ‏ ‏ نکھ سکھ سے درست اور جوان بخت و جوان سال
جادو کی نری آنکھ فقط معجزے کی چال ‏ ‏ ‏ خورشید کے سُم برق کی دُم سنبلہ کی چال
قوت کی طبیعت تھی دلیری کا جگر تھا
عزت کا بدن، فہم کا دل، عقل کا سر تھا

خواجہ آتش نے پکار کر فرمایا کہ "بھئی سلامت علی خدا تم کو سلامت رکھے، کون کہتا ہے کہ تم فقط مضامین اچھے کہتے ہو۔ تم سے بہتر دوسرا شاعر زبان بھی نہیں کہہ سکتا۔"

مرثیہ گوئی کے آسمان پر ضمیر و دبیر ماہ و مشتری کی طرح چمکنے لگے، قدر دانوں کی جوہر شناسی اور اہل کرم کی گوہر پاشی نے لکھنؤ کی خاک پاک سے بیسیوں مرثیہ گو پیدا کر دیے۔ لیکن ان بزرگوں کے سامنے کسی کا چراغ

روشن نہ ہو سکا اور جب کسی نے مقابلہ پر آنے کی ہمت کی زک پائی اور شرمندگی اُٹھائی۔

عام طور پر خیال کیا جانے لگا کہ مرثیہ گوئی درجۂ کمال کو پہونچ گئی اور اب اس صنعت سخن میں ترقی کی گنجائش باقی نہیں۔ یکایک خورشید نے رُخ سے نقاب اُٹھائی۔ گردوں پر رنگ چہرۂ مہتاب فق ہوا۔ میر خلیق کے بلند اقبال صاحبزادے میر ببر علی انیس نے فیض آباد سے آکر لکھنؤ میں مجلس پڑھی اور رزم بزم کی وہ چلتی پھرتی تصویریں دکھائیں کہ "ہذا اکبر" کی صدا ہر گوشہ سے آنے لگی۔

انھوں نے طرز مرثیہ گوئی میں کوئی خاص جدت نہیں کی بلکہ ضمیر و دبیر کے محاسن کلام کا ایک مرقع بنایا اور اس پر میر خلیق کی محاورہ بندی اور میر حسن کی داستان نگاری کا رنگ و روغن چڑھا کر طلسمات کا عالم دکھایا۔ اگلے معبودوں کی پرستش کرنے والے عرصہ تک کوشش کرتے رہے کہ خداوند جدید کے سامنے سر بسجود نہ ہوں لیکن کلام میں وہ معجزہ تھا کہ سب کی گردنیں جھک گئیں۔

خاموش ہیں گو شیشۂ دل چور ہوئے ہیں
اشکوں کے ٹپک پڑنے سے مجبور ہوئے ہیں

میر ضمیر واجد علی شاہ کے عہد تک زندہ رہے اور کہا جاتا ہے کہ آخری زمانہ میں انھوں نے ایک بے نظیر مرثیہ (۱۸۰۰) بند کا لکھا تھا جو مشہور ہوتا تو دبیر و انیس دونوں کے چراغ گل ہو جاتے۔ مگر یہ حکایت غالباً افسانہ ہے۔

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لئے

ان کا کلام جو اس وقت موجود ہے مرزا دبیر کے دفتر ماتم سے بہت کم وزن ہے اور میر انیس کا حریف مقابل اس صنف سخن میں اگر کوئی ہو سکتا ہو تو وہ صرف مرزا دبیر علیہ الرحمۃ کی ذات بابرکات ہے۔

ان دونوں باکمالوں کے نقش قدم پر چلنے والے سیکڑوں پیدا ہوئے لیکن دوسروں کا کیا ذکر ہے خود اُن کے بھائی بیٹے بھی گوئے سبقت نہ لے جا سکے۔ خاندان انیس میں سے مونس و نفیس اور خاندان دبیر میں سے مرزا اوج نے بہت زور مارا لیکن کلمۂ انصاف یہ ہے کہ اپنے بزرگوں کے ہم قدم بھی نہ ہونے پائے۔ آگے بڑھنا تو بہت دشوار تھا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

انیس و دبیر مرثیہ گوئی کو اس نقطۂ عروج تک پہونچا گئے جس کے بعد زوال ہی زوال ہے۔ ان دونوں میں صدر نشین فضیلت کون تھا؟ یہ مسئلہ اس وقت تک زیر بحث ہے۔ علامہ شبلی نے "موازنہ انیس و دبیر" میں مرزا دبیر کو میر انیس کا حریف مقابل قرار دینا بدمذاقی کی دلیل سمجھی ہے لیکن یہ بدمذاقی اس قسم کی تھی کہ سارا لکھنؤ جو اس وقت شعر و سخن کی ٹکسال تھی۔

منہ کھل جاتا ہے یاں کھوٹے کھرے کا پردا
لکھنؤ اہل ہنر کے لیے ٹکسال ہے آج

اسی بلا میں گرفتار تھا اور اُن دونوں باکمالوں کو حریف مقابل سمجھتا تھا "موازنہ" ہندوستان کے ایک مشہور انشا پرداز کے قلم سے نکلا اور اس میں خیالات کا اظہار نہایت بیباکی اور دلیری سے کیا گیا سارے ملک میں آگ لگ گئی۔ دبیریے تو ناراض ہوئے ہی بعض انیسیے بھی خوش

نہ ہوئے۔ اسکی تردید میں کئی کتابیں شائع ہوئیں جن میں سے "المیزان" ادب اردو میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ دبیر کا بہترین کلام علامہ شبلی کی نظر سے نہیں گزرا تھا ورنہ وہ دبیر کی بابت ایسی غیر منصفانہ رائے قائم نہ کرتے جیسی کہ "موازنہ" سے ظاہر ہوتی ہے۔

مؤلف حیات[1] دبیر کا بیان ہے کہ "جب علامہ نے حیات دبیر کو پڑھا ان کی رائے بہت کچھ تبدیل ہوگئی اور انھوں نے صاف الفاظ اعتراف کیا کہ مجھ کو یہ حالات پہلے نہیں معلوم تھے"۔

دونوں استادوں کی روش جداگانہ ہے۔ میر انیس کا کلام فصیح اور شیریں ہے اور مرزا دبیر کا دقیق و ملیح شیرینی اور نمک دونوں کی بنی آدم کو احتیاج ہے اور ایک کو دوسرے پر من کل الوجوہ ترجیح نہیں دی جاسکتی البتہ میر انیس کو یہ فوقیت مرزا صاحب پر حاصل ہے کہ انکے کلام کی سادگی و تاثیر عرصہ تک زندہ رہے گی اور مرزا دبیر کی شوکت الفاظ و بلند پردازی مٹ جائے گی۔ مرزا دبیر نے جو صنائع و بدائع اپنے کلام معجز نظام میں صرف کیے ان کے سمجھنے والے بہت کم باقی ہیں، اور مشرقی علوم سے بے توجہی کا یہی عالم رہا تو چند ہی روز میں شاید کوئی شخص ان صنائع سے لطف اٹھانے والا ہندوستان میں تلاش کرنے سے بھی نہ ملے گا۔ بر خلاف اس کے میر انیس کی سادہ زبان اور محاورہ بندی اسوقت تک مزہ دے گی جبتک کہ اردو زبان زند فسانۂ عجائب جہاں طلسم ہے اور چار درویش برقرار ہے گلزار نسیم پر خزاں کا اندیشہ ہے۔ مثنوی میر حسن سدا بہار ہے یہ نثر ظہوری اور نثر

---

[1] حیات دبیر۔ جلد دوم۔ حصہ اول صفحہ ۴۸۔

اب سمجھنا دشوار ہے۔ گلستان اور بوستان سے ہر فارسی داں لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ سید افضل حسین ثابت لکھنوی نے اپنے بے نظیر گنجینۂ واقعات "حیات دبیر" میں اُن تمام صنعتوں کا مفصل تذکرہ کیا ہے جو مرزا دبیر کے کلام میں پائی جاتی ہیں مگر افسوس ہے کہ اُن میں سے بیشتر کا زمانۂ حال کے تعلیم یافتہ طبقہ نے نام بھی نہ سنا ہوگا۔

مرزا دبیر کی معنی آفرینی اور سحر طرازی دیکھنا ہو تو المیزان اور حیات دبیر کے زریں صفحات ملاحظہ فرمایئے۔ میر صاحب کے کلام کا نمونہ ان اوراق پریشان میں موجود ہے ان دونوں باکمالوں کے معتقدین نے ایک زمانہ میں وہ طوفان برپا کر رکھا تھا کہ بقول سالک دہلوی "ایک طرف کا معتقد دوسری طرف والوں میں ایسے دیکھا جاتا تھا جیسے موحدین میں مشرک اور مسلمانوں میں کافر"۔

مرزا دبیر کے مشہور مرثیہ گو شاگرد میاں مشیر[۱] نے اپنے مخصوص

---

[۱] شیخ گوہر علی مشیر مرزا دبیر کے شاگرد اور ظریفت مرثیہ گوئی کے پیغمبر تھے۔ میر ضمیر کو جس طرح مرثیہ کے طرز نو کی ایجاد کا شرف نصیب ہوا اسیطرح دشمنان اہلبیت کی ظرافت آمیز ہجو میں مرثیہ ایجاد کرنے کا امتیاز بھی حاصل ہے "ہرثیہ" ایک بے معنی لفظ ہے مگر غالباً ہرثیہ مرثیہ کے وزن پر بنایا گیا ہے مرثیہ کا مضمون پر عظمت تھا اگر ظرافت شامل کی جاتی تو مجلس ماتم بزم طرب بنجاتی۔ مشہور ہے کہ کسی ذاکر نے ایک مجلس میں لشکر دشمن کے پہلوان کی بابت یہ مصرع پڑھا۔ ع :- آیا تھا بھبکتا یہ دبکتا ہوا بھاگا

تمام اہل مجلس ہنس پڑے اور اسکا اثر مجلس کے ختم تک نہ زائل ہوا۔ ہنسنے ہنسانے کے لیئے لکھنؤ مرحوم کے زندہ دلوں نے یہ صورت نکالی کہ آٹھویں ربیع الاول کو عزاداری سے فراغت کرکے ۹ ربیع الاول کو جشن عید منعقد کرتے تھے اور اس دن قاتلان حسینؑ کے انجام پر خوشی مناتے تھے کہتے ہیں کہ اس عید میں سب سے پہلے میر ضمیر نے "ہرثیہ" پڑھا اور رنگی

انداز میں سچ کہا تھا۔

جھگڑا بگڑ کا ہے نہ جناب امیر کا ‖ اب قصہ رہ گیا ہی انیس و دبیر کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) تقلید مرزا دبیر اور میر انیس وغیرہ نے بھی کی۔ میاں مشیر نے ساری طاقت مرثیہ صرف کر دی۔ اس فن میں ان کا مقابل بننے کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی۔ رعایت لفظی میں امانت کو مات کیا اور ایسے نادر محاورے استعمال کیے جنکی سند سوائے انکے کلام کے کہیں نہیں مل سکتی۔ انھوں نے مختلف قوموں اور اہل پیشہ کی اصطلاحیں کثرت سے نظم کیں اور اردو شاعری کو ظرافت و شوخی کے انمول خزانہ سے مالامال کر دیا۔ ان کے بعض مصرعے مثلاً "مغلی بن بھی جائے وہ کشمیری ہو گئی" یا "ماضی بنو گے حال نہ پہچانے جائینگے" ضرب المثل کے طور پر بزم احباب میں استعمال ہوتے ہیں اور انکا ہر شعر سننے والوں کے لئے زعفران زار کی کیاری ہے افسوس ہو کہ پھول کے ساتھ کانٹوں کا اتنا انبار ہے کہ اس مقدمہ کی تہذیب ان کے بار کی متحمل نہیں ہو سکتی اور نہ دامن گلچین کو گزند پہونچنے کا اندیشہ ہو ورنہ ان کے بعض مرثیوں کا انتخاب اس مقام پر درج کرتا بنونہ کے طور پر حسب ذیل اشعار جن میں رعایت لفظی کے طومار سے امانت کو شرمندہ کیا ہو نقل کیے جاتے ہیں:۔

(ہندوستانی عورت ایک مغل کی شکایت لیکر حاکم کے سامنے جاتی ہے)

وہ بولی صدقے جاؤں مصیبت سنو مری ‖ مسّی تلک نہ دی مجھے لوٹا دھڑی دھڑی
گہنا تمام لے گیا ملبوس لے گیا ‖ ہاتھوں کی چوہے دنتیاں تک موس لے گیا
چوری کا حال صاف بتانا مجھے پڑا ‖ سنتی ہوں شہ چھڑی کی لگی ہیں گرہ ایکا
ہتیائے کنگن ایسے یہ مغلے شریر ہیں ‖ جوشن لیے گداہ صغیر و کبیر ہیں
نتھ ناک سے اتار لی منھ کیل کر مرا ‖ اور چھپکا دینے سونے کا تعویذ بھی لیا
لے بھاگا ڈھولنا مرا قرآن کی قسم ‖ انگشتری چرائی سلیمان کی قسم
کیا کیا میں تڑپی بجلیوں کے واسطے میاں ‖ بالا بتا کے لے گیا بچپن کی بالیاں

راقم آثم کے لئے ان بزرگوں کی زبان سے نکلا ہوا ہر ایک مصرع تبرک ہے وہ ان دونوں شہنشاہان سخن کے متحد المضامین اشعار کا نمونہ پیش کرتا ہے اور ترجیح کا فیصلہ ناظرین کے ذوق سلیم پر چھوڑتا ہے۔

بسوگند گفتن کہ زر مغربی ست ۔ چہ حاجت محک خود بداند کہ چیست

(۱) دنیا بے حقیقت ہے

دبیر
کھانے کا مزہ فقط زبانی نکلا ۔ باقی سامان عیش فانی نکلا
چاہا تھا کہ ہاتھ دھوئیں دنیا سے دبیر ۔ اتنا بھی اس کنوئیں سے پانی نکلا

انیس
راحت کا مزہ عدم سے جانی نکلا ۔ دل ہے نہ کبھی غم نہانی نکلا
پیاسے ہے لگے چاہ دنیا پہ انیس ۔ نکلا بھی کبھی تو شور پانی نکلا

(۲) احوال حضرت حر

دبیر
حُر کو کیا بخت کبریا نے بخشا ۔ یہ نام اسے بخت رسا نے بخشا
جب عذر گنہ کرتا تھا کہتے تھے حسینؑ ۔ میں نے بخشا مرے خدا نے بخشا

انیس
جب حُر کا گنہ شاہ اُمم نے بخشا ۔ قطرے کو شرف بحر کرم نے بخشا
گردوں سے ندا آئی کہ اے سبط نبی ۔ تو نے جسے بخشا اسے ہم نے بخشا

(۳) فکر ما بعد الموت

دبیر
برزخ کی صعوبات کٹے گی کیونکر ۔ تنہائی میں اوقات کٹے گی کیونکر
غفلت میں دبیر صبح پیری ہوئی شام ۔ دن کاٹ ہوا رات کٹے گی کیونکر

انیس
دردو الم ممات کیونکر گزرے ۔ یہ چند نفس حیات کیونکر گزرے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱)

بیٹے مرے استاد لئے آگئی خزاں ۔ بیچیں نہنت ام کے ہاتھوں وہ انتیاں
سب چیز بست باندھ کے بستے میں لے گیا ۔ موتی کے جالے پانی ہو ستے میں لے گیا

پیری کی بھی نو بہر ڈھلی شکر نہیں — اب دیکھیں لحد کی رات کیونکر گزرے

(۴) سفر آخرت و بے ثباتی دنیا

دبیر
آج آئے ہیں کل کوچ کی تیاری ہے — غفلت میں کٹی عمر یہ ہشیاری ہے
دنیا ہے عجب مقام حیرت نہ کھلا — یہ عالم خواب ہے کہ بیداری ہے

انیس
اب خواب سے چونک وقت بیداری ہے — لے زاد سفر کوچ کی تیاری ہے
مر مر کے پہونچتے ہیں مسافر یاں تک — یہ قبر کی منزل بھی غضب بھاری ہے

(۵) شاعرانہ خود ستائی

دبیر
شیریں مضامیں کو کہاں بند کروں — کیا طبع کا دریائے رواں بند کروں
خلاق مضامیں تو سبھی ہیں لیکن — کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

انیس
گلہائے مضامیں کو کہاں بند کروں — خوشبو نہیں چھپنے کی کہاں بند کروں
ہیں باعث نغمہ سنجی بلبل ہوں — کھولے نہ کبھی منہ جو زباں بند کروں

(۶) خاکساری

دبیر
بندوں پہ کرم حضرت باری کا ہے — مقدور کسے شکر گزاری کا ہے
دی ہے جو خدا نے سرفرازی مجھ کو — ثمرہ یہ نہال خاکساری کا ہے

انیس
دل کو مرے شغل غمگساری کا ہے — غفلت میں بھی طور ہوشیاری کا ہے
گردوں کو اگر ہے سرکشی کا غرہ — ہم کو بھی غرور خاکساری کا ہے

(۷) اظہار کمال

دبیر
گنجینہ جسے رب ہدا دیتا ہے — وہ داد عطیہ خدا دیتا ہے
خاموش حباب ہوکے ہیں ظرف خالی — دریا میں ہیں جو تہی تو صدا دیتا ہے

انیس
رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے — وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی — جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

(۸) قبر

دبیر

اک دن پیوندِ خاک ہونا ہوگا — تنہا تنہا۔ لحد میں سونا ہوگا
اس قبر کے پردے کا کھلا حال دبیر — جو اوڑھنا ہے گا وہ بچھونا ہوگا

انیس

آغوش لحد میں جب کہ سونا ہوگا — جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیس — ہم ہوویں گے اور قبر کا کونا ہوگا

(۹) شیریں سخنی

دبیر

شیریں سخنی پہ موردِ تحسیں ہوں — واللہ نہ عیب بیں نہ نکتہ چیں ہوں
سکتے ہیں ہما ہی میرے سخنِ شیریں سے — شکر تا ہی کیا منہ جو کہے شیریں ہوں

انیس

کس منھ سے کہوں لائق تحسیں ہوں میں — کیا لطف جو گل کہے کہ رنگیں ہوں میں
ہوتی ہے حلاوتِ سخن خود ظاہر — کہتی ہے کبھی شکر کہ شیریں ہوں میں

(۱۰) آنسو

دبیر

مجلس میں گل اشک عزا لوٹے ہیں — ثابت ہے دلا شیشۂ دل ٹوٹے ہیں
یاں اشک ریائی کا بھی ہے مول بہشت — موتی سچے ہیں جوہری جھوٹے ہیں

انیس

داغ غمِ شہ سینے میں گل بوٹے ہیں — کیا کیا گہر بیش بہا لوٹے ہیں
مجلس میں ریا سے جو کہ روتے ہیں انیس — اشک اُنکے بھی موتی ہیں مگر جھوٹے ہیں

(۱۱) طلوع آفتاب

دبیر

تھی بسکہ صبح قتلِ شہنشاہ نامدار — اہل حرم تھے جیب دریدہ اور اشکبار
تار شعاع سے یہی ہوتا تھا آشکار — خورشید نے کیا ہو گریباں کو تار تار
پو پھٹتے ہی۔ رسول کا داماں پھٹ گیا
زہرا کے بھی کفن کا گریبان پھٹ گیا

انیس

تھا بسکہ روزِ قتل شہِ آسماں جناب
نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب
تھی نہر علقمہ بھی خجالت سے آب آب
روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں حباب
پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

(۱۲) دولت اور شرافت کا مقابلہ

دبیر

ساماں سے کوئی صاحبِ ایماں نہیں ہوتا
ہر اہلِ عصا موسیٰ عمراں نہیں ہوتا
پہنے جو انگوٹھی وہ سلیماں نہیں ہوتا
آئینہ گر اسکندرِ دوراں نہیں ہوتا
لاکھ اوج ہو پشہ کا ہما ہو نہیں جاتا
بُت سجدۂ کافر سے خدا ہو نہیں جاتا

انیس

کچھ خارِ مغیلاں گلِ تر ہو نہیں جاتا
قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں جاتا
ہر قطرۂ ناچیز گہر ہو نہیں جاتا
مس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں جاتا
جس پاس عصا ہو اسے موسیٰ نہیں کہتے
ہر ہاتھ کو عاقل یدِ بیضا نہیں کہتے

(۱۳) اولاد کا صدمہ

دبیر

وہ درد ہی کیا درد کہ درماں نہیں رکھتا
وہ رنج ہی کیا رنج کہ پایاں نہیں رکھتا
کس زخم کا مرہم دلِ انساں نہیں رکھتا
کس چاک کا پیوند گریباں نہیں رکھتا
بے صبر جس اندوہ میں ہر ایک بشر ہے
وہ داغِ پسر داغِ پسر داغِ پسر ہے
جس درد کی تسکیں میں ہیں عاجز خردمند
وہ درد ہی کیا۔ رحلتِ فرزندِ جگربند
جب دست و گریباں ہو پدر غمِ فرزند سے
وہ چاک یہی چاک ہے جس کا نہیں پیوند
سچ پوچھو تو فرزند کلیجہ ہے پدر کا

ناسور جگر میں نہ ہو اس لخت جگر کا

فرزند گلِ باغ تمنائے پدر ہے — بے قدر رہی وہ شاخ جو بے برگ و ثمر ہی
تعویذ تسلیِ دل خلق پسر ہے — داغ اسکا شگاف جگر و زخم جگر ہی
کیوں دل میں پدر کے نہ ہو ناسور خلف کا
جب چاک گہر کے لئے سینہ ہو صدف کا

انیس
دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے پسر کا داغ — دل کو نگار کرتا ہی لخت جگر کا داغ
آنکھوں کا نور کھوتا ہی نور بصر کا داغ — مرنا جوان بیٹے کا ہی عمر بھر کا داغ
یہ حال ابن فاطمہ کے دل سے پوچھئے
زخم جگر کے درد کو گھائل سے پوچھئے

ماں باپ کی آسائش و راحت ہی پسر سے — تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہی پسر سے
خوں جسم میں آنکھوں میں بصارت ہی پسر سے — ایامِ ضعیفی میں بھی طاقت ہی پسر سے
آرام جگر، قوت دل۔ راحت جاں ہے
پیری میں یہ طاقت ہی کہ فرزند جواں ہے

مالک سے بھرے گھر کے اجڑ جانے کو پوچھو — گھر والوں سے اس تفرقہ پڑ جانے کو پوچھو
ماں باپ سے قسمت کے بگڑ جانے کو پوچھو — یعقوبؑ سے یوسفؑ کے بچھڑ جانے کو پوچھو
اللہ دکھائے نہ الم نور نظر کا
بہ جاتا ہے آنکھوں سے لہو قلب و جگر کا

(۱۴) راکب و مرکب

دبیر
مرکب تو ہی پر راکب ذیشاں بھی ہو ایسا — طور ایسا ہو تو موسیٔ عمراں بھی ہو ایسا
اورنگ ہو ایسا تو سلیماں بھی ہو ایسا — اس شان کی ہو رحل تو قرآں بھی ہو ایسا
آہو بھی کہیں شیر حجازی ہو تو ایسا

غازی ہو تو ایسا ہو جو تازی ہو تو ایسا ہو

انیس
تھا زین فرس رحل تو قرآں شہ والا — وہ تخت ہوا تھا تو سلیماں شہ والا
وہ دوشِ صبا تختۂ گلستاں شہ والا — وہ برجِ شرف نیّرِ تاباں شہ والا
بو گل کی نسیم سحری لے کے چلی ہے
غل تھا کہ سلیماں کو پری لے کے چلی ہے

(۱۵) امام حسین عؑ کی شہزادی سکینہ کو وصیت وقت رخصت

دبیر
سینے پہ مرے سو چکیں اب خاک پہ سونا — آخر ہے زمیں بھی تو غریبوں کا بچھونا
گو قہر ہے اس سن میں جدا باپ سے ہونا — لاشہ مرا تڑپے گا بہت مجھکو نہ رونا
گر چاہو مری روح ہو نا شاد سکینہ
تو غم میں مرے کیجیو نہ فریاد سکینہ

انیس
دنیا ہے یہ۔ شادی ہے کبھی اور کبھی آلام — راحت کی کبھی صبح مصیبت کی کبھی شام
یکساں نہیں ہوتا کسی آغاز کا انجام — وہ دن گئے گو کرتی تھیں جو ہم سینے پہ آرام
ضد کر کے نہ اب باپ کو رویا کرو بی بی
جب ہم نہ ہوں تم خاک پہ سویا کرو بی بی

(۱۶) زلف و رُخ

دبیر
لاریب جرم ہے جو کہیں چاند رخ کو ہم — ہے چاند میں تو جرم یہ بے جرم لاجرم
رُخ ہے وہ صبح شمس ہیں جسکے شہ امم — گیسو وہ شب کہ قدر شب قدر جس سے کم
گیسو و رخ تو قدرتِ داور دکھاتے ہیں
ہر وقت صبح و شام برابر دکھاتے ہیں

انیس
پیدا ہے زلف و روئے منور سے شانِ رب — نکلا ہے آفتاب میانِ سوادِ شب
یہ لطف عید اور شب قدر میں ہے کب — ہیں دو طرف تو چین ختن بیچ میں حلب

رستہ نہ بھول جائے مسافر ہجوم میں
اک شب کا فاصلہ ہے فقط شام و روم میں

(۱۷) گرمی

دبیر

وہ دھوپ کہ مرغان ہوا کرتے ہیں نالا ۔ بس ہاتھ دھرا قبضہ پہ اور پڑ گیا چھالا
بریاں ہوا دانہ بھی زراعت میں جو ڈالا ۔ اس دھوپ میں اس لو میں کھڑے ہیں شہ والا
پانی کے عوض آگ برستی ہے زمیں پر
پر تیروں کی بوچھار ہے جسم شہ دیں پر

انیس

وہ دھوپ کی تیزی غضب اور لو کا وہ چلنا ۔ وہ دوپہر اس دشت کی اور دن کا وہ ڈھلنا
ہر ایک بدن سے وہ پسینے کا نکلنا ۔ اور تن پہ حرارت سے وہ ہتیاروں کا جلنا
جنگل کے پرندے سبھی جھیلوں میں پڑے ہیں
اور دھوپ میں پیاسے شہ مظلوم کھڑے ہیں

دبیر

مٹی خراب چرخ پہ ہے برج آب کی ۔ انگشت سے برج حوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی ۔ حدت سے موج موج میں تیر شہاب کی
فوارے کو نہ عوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں ۔ انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں ۔ تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیٔ روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

(۱۸) امام حسینؑ کا مدینہ سے رخصت ہونا اور حضرت فاطمہ صغرا کو بیمار چھوڑنا

(سید افضل حسین ثابت لکھنوی مؤلف حیات دبیر نے اپنے ہیرو کے

کلام سے بند انتخاب کر کے ایک مسلسل مرثیہ مرتب کیا ہے اور اُردو شاعری کے چہرے سے یہ داغ دُور کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس میں کوئی ایپک پوئیم (رزمیہ نظم) موجود نہیں۔ اسی طرح سید منظور علی علوی مؤلف واقعات[1] کربلا نے میر انیس کے کلام سے بند انتخاب کر کے ایک مسلسل مرثیہ مرتب کیا ہے۔ جامع الاوراق اس ناچیز تالیف کو ان بیش بہا منتخبات کا پہلا سین اقتباس کر کے زینت دیتا ہے)

کلام مرزا دبیر علیہ الرحمۃ

جب سراسیمہ وطن سے شہ ابرار چلے (۱) سرفروشی کو شہادت کے خریدار چلے
کہتی تھی فاطمہ صغرا کہ ہمیں مار چلے لو مسیحا بھی مجھے چھوڑ کے بیمار چلے
ساتھ اماں کے نہ ہمراہ پدر جاتی ہوں
لوگو بتلاؤ تو میں کیوں نہیں مر جاتی ہوں

ہاتھ پکڑے ہوئے اکبر کا ہیں بابا تیار (۲) بھیا اصغر کو لئے ہو گئیں اماں بھی سوار
یہ نہ جانا ہے مرے دم سے لگی اک بیمار رو کے مجرا تو لیا اور نہ کہا برخوردار
ٹھہرو اے صاحبو ٹھہرو مجھے آ لینے دو
بھیا اصغر کو کلیجے سے لگا لینے دو

مجھ کو الفت ہے تمھاری تمھیں الفت ہی نہیں (۳) ساتھ دوڑوں جو سواری کے سو طاقت ہی نہیں
اماں لیں گود میں ایسی مری قسمت ہی نہیں پیار آ جائے پدر کو سو یہ صورت ہی نہیں
لونڈیاں ساتھ چلیں آج عزیزوں کی طرح
میں جو بیٹی تھی رہی گھر میں کنیزوں کی طرح

جس نے چلنے کو کہا سب نے کہا بسم اللہ (۴) مجھ سے بھولوں بھی نہ پوچھا میں گنہگار تھی آہ

[1] یہ کتاب انوار بکڈپو امین آباد لکھنؤ میں بہ قیمت روپیہ آٹھ آنہ ملتی ہے ۱۲۰

گر خطا ہے یہ خطا ہی جو گنہ ہی یہ گناہ ان دنوں شدّتِ تپ سے مری حالت ہے تباہ
یہی تا دو دو پہر غش میں پڑی رہتی ہوں
اب تو ہشیار رہوں چلنے کے لیے کہتی ہوں

بیٹھے بیٹھے مرا اس وقت کا چلنا دیکھو (۵) گرنا بے ساختہ مشکل سے سنبھلنا دیکھو
تپ میں کیا دیکھا تھا اب دل کا اچھلنا دیکھو ہاتھ میں باندھتی ہوں ہاتھوں کا ملنا دیکھو
زردی آنکھوں کی تڑپ دل کی دھڑک سینے کی
سب یہ مرجانے کی باتیں ہیں نہیں جینے کی

یک بیک میرے مقدر کا بگڑنا دیکھو (۶) پاؤں پڑتی ہوں مرا پاؤں رگڑنا دیکھو
سانس کا بات کے کرنے میں اکھڑنا دیکھو حال یہ اس پہ عزیزوں کا بچھڑنا دیکھو
غیر بھی ایسے مریضوں کو نہ تنہا چھوڑیں
حیف ہے بیٹی کو اس وقت میں بابا چھوڑیں

میری خاطر جو کریں کیا ہے حرج میرے بن (۷) دل کے بہلانے کو ہمراہ ہیں بچے کم سن
ان کی خاطر ہے روا چلنا ہی جن کا ممکن میرا کیا آج اگر مر گئی کل دوسرا دن
انس اکبر و سکینہ کا ہے خوش ہونے کو
مجھ سے الفت کریں چالیسویں تک رونے کو

یہ تو اس کوچ سے اب ہو گیا صغرا کو یقیں (۸) باپ کے ہاتھ کی مٹی مری قسمت میں نہیں
سب کو بابا نے مرے سامنے الوادیاں دیں مجھکو تابوت ہی چھوٹا سا منگا دیں شہِ دیں
بعد مرنے کے لبِ گور جو جائے صغرا
باپ کے ہاتھ کا تابوت تو پائے صغرا

اماں واقف ہیں مجھے بھاتی ہے اصغر کی بو (۹) کرتا پہنا ہوا اسکا دیئے جائیں مجھ کو
وقت مرنے کے وصیت یہ کرونگی رو رو کرتا اصغر کا کفن میں مرے رکھیو لوگو

قبر میں بھائی کے کرتہ پہ مرا ہاتھ رہے
یہ دوا دل کے تڑپنے کی مرے ساتھ رہے

ہائے اب میں ہوں یہ تنہائی ہے اور سونا گھر (۱۰) نہ خبر مجھ کو تمہاری نہ تمہیں میری خبر
دل کے بہلانے کو تم سب گئے ہو بھیا اصغر — خالی جھولے سے میں ٹکراؤں گی یا اپنا سر
الفتیں دیکھ کے ایک ایک کی میں سیر ہوئی
ہائے اللہ مری موت کو کیوں دیر ہوئی

میں نے چاہا تھا نہ دکھلاؤں یہ حال اپنا زبوں (۱۱) جاؤں در پر بھی نہ رخصت کیلئے میں محزوں
پھر میں یہ سوچی کہ حقیر اور بھی کہنے میں نہ ہوں — بات ہی جب کوئی پوچھے تو کس سے رو دھوؤں
متوجہ جو کسی کو میں نہیں پاتی ہوں
آپ ہی رو دھتی ہوں آپ ہی من جاتی ہوں

کہتے کہتے یہ گری خاک پہ صغرا ناگاہ (۱۲) سمجھے سب مر گئی وہ بولے کہ انا للہ
پردہ محمل کا اٹھایا تو پکاریں یا شاہ — نامبارک ہے سفر مر گئی بیٹی مری آہ
کیا صغریٰ نے سفر میں نہ سفر جاؤں گی
چھوڑ کر بیٹی کی میت کو کدھر جاؤں گی

اترے روتے ہوئے گھوڑے سے امام خوش خو — اور کہا کہہ دو ابھی کوچ کا نقارہ نہ ہو
گود میں بیٹی کو لے کر کہا بی بی بولو — دیکھ کر نبض دھرا ہاتھ کو دل پر درد
غش سے صغرا کے جو سب بیبیوں کو سکتا تھا
رو کے اصغر بھی بس ایک ایک کا منہ تکتا تھا

ہوش میں آئی جو صغرا تو کیا شہ نے مقال (۱۳) اس نقاہت پہ مری جان سفر کا ہے خیال
بولی وہ میں بھی تو بابا یہی کرتی ہوں سوال — چھوڑ دو تنہا اسے تم گھر میں ہو جس کا یہ حال
بعد اگر آپ کے جانے کے غش آتا مجھ کو — کون اس پیار سے گودی میں اٹھاتا مجھ کو

گو کہ میں غش میں تھی پر سنا یہ کانوں نے سنا (۱۵) مجھ کو غش آیا تو چلا کے یہ اماں نے کہا
دوڑو صاحب کہ ہوئی غش مری بیٹی صغرا بعد انکے بھی کوئی چاہے گا مجھ کو ایسا

نانی صاحب کو بھی گو میری بہت الفت ہے
ماں کی شفقت میں مگر اور ہی کچھ لذت ہے

درد سر، سوزش دل، رنج، بخار ایک طرف (۱۶) اور یہ ہجر شہ عرش وقار ایک طرف
سو علاج ایک طرف آپکا پیار ایک طرف لاکھ چین ایک طرف شہ کا کنبا ایک طرف

گر قضا ہے تو فراق شہ ابرار سے ہے
گر شفا ہے تو اسی شربت دیدار سے ہے

چاند کے ٹکڑے چلے ہیں کئی ہمراہ حضور (۱۷) چشم بد دور کہ ہے راہ کا خطرہ مشہور
وقت پر چاہیے کچھ اُن کے تصدق کو ضرور صدقے ہونے کیلئے چلتی ہے صغرا رنجور

جس پہ تم چاہیو اس پر مجھے قرباں کرنا
لیکن اصغرؑ پہ فدا کرنا تو احساں کرنا

یہ جو کہتے ہیں کہ منزل میں کہاں ہوگی دوا (۱۸) سو بھی سے مجھیں اس بات کی دیتی ہوں رضا
آپ کی جان سے دور آئے اگر میری قضا نہ حرج کیجیے گا میرے لیے منزل کا

طور بے طور جہاں دیکھیو اس دختر کے
چھوڑ جانا علی اصغر پہ تصدق کر کے

منہ پہ حضرت کے یہ کوئی نہ کرے گا پھر چرچا (۱۹) مردہ صغرا کا کئی دن رہا جنگل میں پڑا
اور کہے گا بھی تو ہے تو آپ کے کہنے کو بھی جا اپنی بیٹی کا میں مختار تھا چاہا سو کیا

مردہ صغرا کا جو ویرانے میں چھوڑ آیا ہوں
مرنے والی کی وصیت میں بجا لایا ہوں

رو کے شہ بولے یہ کیا تو نے سنایا اے وائے (۲۰) اے مری جان ترا مردہ اور اس قابل ہائے

مرتے دم چھوڑ کے رستے میں تمھیں بابا جائے — نہ تو نہلائے نہ کفنائے نہ تم کو دفنائے
گو ثواب اس میں تجھے اے مری صغریٰ ہوگا
پر مرے واسطے دنیا میں کہو۔ کیا ہوگا

ہے یہ وہ موت کہ ہاتھ آتی ہے ہر ایک کو کم (۲۱) اس مرنے سے وہی واقف ہے جو ہو یوں بیدم
رو کے صغریٰ نے یہ کی عرض کہ یا شاہِ امم — پھر سزاوار ہے کون اسکا کہا شاہ نے ہم
جا کے سر منزل آخر میں جو کٹوا دیں گے
بے کفن چھوڑ کے سب ہم کو چلے جائیں گے

یہ خبر سنتے ہی گویا ہوئی صغریٰ بے دم (۲۲) تذکرہ کرنے لگے اور شہنشاہِ امم
بانو صغریٰ سے لگی پوچھنے رخصت ہوں ہم — بس نہ رو دو تمھیں اپنے علی اصغر کی قسم
کچھ ہراساں ہوئی اور کچھ ہوئی مضطر صغریٰ
گر پڑی اونٹ کے نزدیک مچل کر صغریٰ

پھینک دی ٹوپی کو ہاتھوں سے ملا منہ پہ غبار (۲۳) کھولے بازو سے پھر اس رنج میں تعویذ نجار
بالیاں کانوں سے خلخال لی پاؤں سے اتار — ہنسلیاں طوق گلے سے بھی اتارے ایکبار
کہا بانو نے کہ صغریٰ کو سنبھالو کوئی
غصّہ آیا مری بی بی کو منا لو کوئی

کہا صغریٰ نے کہ بس بس نہ کر اٹھاؤ امّاں (۲۴) کون ہوں میں مجھے کاہے کو مناؤ امّاں
اب یہ زیور بھی سکینہ کو پنہاؤ امّاں — میں نہیں بولتی جاتی ہو تو جاؤ امّاں
جان پر کھیلی ہوں زنہار نہیں جینے کی
لو قسم۔ کل سے دوا بھی میں نہیں پینے کی

مرنے والی کے لئے کچھ نہیں زیور درکار (۲۵) جس کو چاہو اسے بخشش کرو تم ہو مختار
میں نہیں باندھونگی لے جاؤ یہ تعویذ نجار — آپکے ہاتھ کے پہنوں گی نہ گہنے زنہار

آج سے فرش پہ صغریٰ کا نہ سونا ہوگا
سنگ تکیہ مرا اور خاک بچھونا ہوگا

کہا بانو نے میں صدقے گئی کچھ میری خطا — مجھ پہ غصہ ہو بیٰی اور باپ پہ کچھ بس نہ چلا
بولی صغریٰ کہ میں ناحق تو نہیں تم سے خفا — تم جو لے چلتیں مجھے کیا کوئی شکوہ کرتا
ہے شکایت تمھیں صغریٰ کے خفا ہونے کی
میری غربت پہ ہے اسوقت جگہ رونے کی

رو کے بانو نے کہا میں تری غربت پہ فدا — گر کہو دن سے اب اُتر دل میں یہ بیکس دکھیا
ہاتھ باندھوں میں ترے پاؤں پڑوں اے صغرا — پھر ملوں یا نہ ملوں تم نہ ہو مادر سے خفا
راہ بھر جاؤنگی روتی تری خاطر صغرا
پہلی منزل ہی میں مر جاؤں گی آخر صغرا

ماں کی منت سے حیا آگئی بولی رُو رُو — امّاں لو جاؤ سدھارو تمھیں سونپا حق کو
بھیّا اصغر سے ذرا کہدو بہن کو دیکھو — دودھ پیتے ہوں تو تکلیف نہ دو کچھ نہ کہو
چاہتے ہیں جو مجھے آپ ہمک کر دیکھیں
دیکھوں اصغر کو میں اب اور مجھے اصغر دیکھیں

ماں کے آغوش میں ناداں پی رہا تھا دودھ اصغر — سُن کے بیمار کی آواز وہ ہمکا رُو کر
کی ہر اک سمت کو الفت بھری آنکھوں سے نظر — کہا صغرا نے ادھر دیکھو کھڑی ہوں میں ادھر
سہمے سہمے ہوئے کچھ تم نگراں ہوتے ہو
سُرمہ آنکھوں کا بہا جاتا ہے کیوں روتے ہو

الوداع اے مرے ننھے سے مسافر ناداں — الوداع اے مرے معصوم میں تجھ پر قربان
آج ہی منہ پہ ہیں پردیسیوں کی ساری نشان — مسکرانا، نہ اشارہ، نہ ہمکنا اس آن
میرے بھولے مرے پیارے مرے کمسن بھائی — گھٹنیوں بھی نہ چلے گھر میں تم اک دن بھائی

چشم بد دور جب ان آنکھوں کا آئے گا خیال — آنکھیں رو رو کے شب و روز کرینگی میں لال
دل پہ لہرائینگے ہر دم یہ چھنڈولے ترے بال — انھیں بالوں کی طرح ہوگا پریشاں مرا حال
چومنے پر ان انگوٹھوں کے ہو قرباں صغرا
اب رہیگی یہاں انگشت بدنداں صغرا

ایک ایک دم میں ترے لاکھ دم اے نور نگاہ — مصطفےٰ ہیں ترے نگہبان علی پشت و پناہ
صد و سی سال ترے سر پہ سلامت رہیں شاہ — باپ کے سائے میں پروان چڑھائے اللہ
تپ میں ہوں اسلئے گودی میں نہیں لیتی ہوں
ضامنی میں تمھیں اللہ کی میں دیتی ہوں

پھر یہ زینب نے کہا راتوں کو میں تڑپوں گی — جلد تم لاؤگی بابا کو تو لونڈی ہوں گی
ہاں پھوپھی اپنے پدر کو میں تمھیں سے لونگی — وہ پکاریں جو خدا چاہے گا تو ہاں دونگی
وعدہ اسکا تو نہیں تم سے کئے جاتی ہوں
پر فدا کرنے کو دو بیٹے لئے جاتی ہوں

اسطرح ہوتی تھی اک ایک سے رخصت بیمار — کہ بجا کوچ کا نقارہ ہوئے شاہ سوار
در دولت سے بڑھی آگے سواروں کی قطار — ناگہاں آئی صدا ایک طرف سے اک بار
سمجھو اب خانۂ پنجتن پاک ہوا
سنی جس جس نے وہ آواز جگر چاک ہوا

کلام میر انیس علیہ الرحمۃ

کنعان محمدؐ کے حسینوں کا سفر ہے — خورشید لقا زہرہ جبینوں کا سفر ہے
چھٹتا ہے وطن گوشہ نشینوں کا سفر ہے — اکدن کا نہیں کوچ مہینوں کا سفر ہے
گلرو چمن دہر سے جانے کو چلے ہیں
گھر چھوڑ کے جنگل کے بسانے کو چلے ہیں

دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے — جانے وہی بلبل جو بچھڑ جائے چمن سے
واقف ہے مسافر کا دل اس رنج و محن سے — چھٹتا نہیں وہ جان نکل جاتی ہے تن سے
آرام کی صورت نہیں مسکن سے بچھڑ کر
طائر بھی پھڑکتا ہے نشیمن سے بچھڑ کر

غربت کی بھی ہوتی ہے عجب صبح عجب شام — کرتا ہے سفر قافلۂ راحت و آرام
وہ دشت نوردی وہ غم و صدمۂ و آلام — منزل پہ بھی ممکن نہیں راحت کا سرانجام
نیند آتی ہے کب لاکھ جو ٹپکے وہ سر اپنا
یاد آتا ہے منزل پہ مسافر کو گھر اپنا

اس فصل میں ہے نہضت فرزند پیمبر — جن روزوں پکھیرو بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
اندھیر ہے خاک اُڑتی ہے لو چلتی ہے دن بھر — جن لوؤں سے پرندے بھی نکلتے نہیں باہر
یہ دھوپ میں شدت ہے کہ سب گوشہ نشیں ہیں
سایہ کہاں پتے بھی درختوں میں نہیں ہیں

وہ لو وہ تپش اور وہ گرمی کا مہینا — سردی میں ہو ذکر اسکا تو آجائے پسینا
دشوار ہے اس دھوپ میں معصوموں کا جینا — ویرانہ ہے بستی میں اجڑتا ہے مدینا
حضرت بھی گھلے جاتے ہیں تشویش سفر سے
ہیں ساتھ وہ بچے کہ جو نکلے نہیں گھر سے

برپا ہے مدینہ میں تلاطم کئی دن سے — ہے راحت و آرام و طرب گم کئی دن سے
ہر گھر میں ہے اک شورِ تظلم کئی دن سے — منہ ڈھانپے ہوئے روتے ہیں مردم کئی دن سے
وہ غم ہے کہ آرام کا جویا نہیں کوئی
راتیں کئی گذری ہیں کہ سویا نہیں کوئی

کہتا ہے کوئی کیا ہوا یہ بیٹھے بٹھائے (۷) کیا جانیے خط کوفہ سے کسطرح کے آئے

روضہ پہ نبیؐ کے شہِ دیں رہنے نہ پائے   کچھ ایسا ہو یا رب کہ یہ مظلوم نہ جائے
کوفے میں محبت نہ مروت نہ حیا ہے
خط مکر سے لکھے ہیں بلانے میں دغا ہے

خلقت کا ہے مجمع درِ دولت پہ سحر سے (۸) جو آتا ہے روتا ہوا آتا ہے وہ گھر سے
سب کہتے ہیں برسا کے لہو دیدۂ تر سے   چھپ جائیگا اب فاطمہ کا چاند نظر سے
اندھیر ہے گر یہ شہ والا نہ رہے گا
اب شہر کی گلیوں میں اجالا نہ رہے گا

در پر کوئی روتا ہے کوئی راہ گزر میں   تاریک ہے دنیا کسی غمگیں کی نظر میں
ہیں جمع محلّہ کی جو سب بیبیاں گھر میں   اک حشر ہے ناموس شہِ جن و بشر میں
سب مل کے بکا کرتے ہیں جب آتا ہے کوئی
یوں روتے ہیں جس طرح کہ مر جاتا ہے کوئی

سب کہتے ہیں زینب سے کہ اے شاہ کی شیدا   کس طرح کے خط آئے یکایک یہ ہوا کیا
پانی کی کمی گرمی کے دن خوف کا رستا   وہ دھوپ پہاڑوں کی وہ لو اور وہ صحرا
کیا سوچ کے اس فصل میں شبیرؑ چلے ہیں
بچوں پہ کرو رحم کہ نازوں کے پلے ہیں

منھ دیکھ کے اصغر کا چلا آتا ہے رونا   آرام سے مادر کی کہاں گود میں سونا
جھولا یہ کہاں اور کہاں نرم بچھونا   لکھا تھا اسی سن میں مسافر انھیں ہونا
کیا ہوگا جو میداں میں ہوا گرم چلے گی
یہ پھول سے کملائیں گے ماں ہاتھ ملے گی

سنتے ہیں یہ ہر وارد و صادر کی زبانی   جھیلوں میں بھی نہروں میں بھی سب خشک ہے پانی
اس فصل میں ہوتی ہے بہت تشنہ دہانی   کس طرح جئیں گے اسد اللہ کے جانی

ٹوٹتا ہوا بچہ کبھی جانبر نہیں ہوتا
جب خشک ہوا پھول تو پھر تر نہیں ہوتا

ہے ہے چھ مہینے کے بھی بچے کا سفر ہے (۱۳) کچھ تم کو پہاڑوں کی بھی گرمی کی خبر ہے
غربت میں جوانوں کے تلف ہونے کا ڈر ہے رحم اس پہ ہی لازم کہ یہ بچہ گلِ تر ہے
اصغر کو جدا دکھ ہو قلق ماں کو جدا ہو
گرمی کے سبب دودھ جو گھٹ جائے تو کیا ہو

فرماتی تھیں زینب نہیں بھیا کوئی چارا (۱۴) قسمت میں تباہی ہو تو کیا زور ہمارا
گھر چھوڑ کے جانا ہے کسی کو بھی گوارا مجبور ہے مضطر ہے ید اللہ کا پیارا
ایام مصیبت میں یہ تنہائی کے دن ہیں
غربت کی شبیں بادیہ پیمائی کے دن ہیں

باتیں یہ ابھی تھیں کہ شہ بحر و بر آئے (۱۵) دیکھا رخ ہمشیر کو اور اشک بھر آئے
ماں بیٹھی تھی صغریٰ کو جو چھاتی سے لگائے روتے ہوئے تشریف شہ دیں وہیں لائے
بیٹی شہ ذی جاہ کی تعظیم کو اوٹھی
بستر سے عصا تھام کے تسلیم کو اوٹھی

جلد اسکے قریب آکے یہ کہنے لگے حضرت بیٹھو کہ ابھی اوٹھنے کی تم میں نہیں طاقت
اک ضعف کی تصویر ہو ایسی ہے نقاہت کیوں رات کو کیسی رہی بی بی کی طبیعت
تپ میں جو کراہی تھیں تو گھبرائے تھے صغریٰ
بیہوش تھیں تم شب کو بھی ہم آئے تھے صغریٰ

صحت تمھیں حق دے یہی بابا کی دعا ہے (۱۶) اولاد کو راحت ہو تو جینے کا مزا ہے
اب بادیہ پیمائی سے ایذا ہے بلا ہے کیا جانئے شبیر کی تقدیر میں کیا ہے
دل جلتا ہے جب تپ میں تمھیں پاتا ہوں صغریٰ اس رنج سے میں اور گھلا جاتا ہوں صغریٰ

ایسا سفر صعب[1] اور اس طرح کا بیمار (۱۸) ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائے کہیں راہ میں آزار
کیا نرگسی آنکھوں سے نقاہت ہے نمودار   سب زردیِ رخسار حرارت سے تن آزار
چہرے پہ کسی روز بحالی نہیں پاتا
شدت سے کبھی نبض کو خالی نہیں پاتا

دم چڑھتا ہے بستر سے اٹھاتی ہو اگر سر (۱۹) بی بی کہو محمل میں چڑھا جائے گا کیونکر
گھر میں تمھیں پانی کی بھڑک رہتی ہے دن بھر   پھر کیا ہو کسی دن جو نہ پانی ہو میسر
تم جانے کے قابل نہیں میں رہ نہیں سکتا
شب سے ہے یہ تشویش کہ کچھ کہہ نہیں سکتا

لو چلتی ہے خاک اڑتی ہے گرمی کے ہیں ایام (۲۰) منزل پہ نہ راحت نہ کہیں راہ میں آرام
بستی ہے کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام   دریا کہیں حائل کہیں پانی کا نہیں نام
صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گزر جائے
اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مر جائے

گھر میں تمھیں چھوڑوں یہ نہیں دل کو گوارا (۲۱) لیجاؤں تو بچنا نہیں ممکن ہے تمھارا
بچوں میں کوئی تم سے زیادہ نہیں پیارا   مجبور ہوں بے ہجر نہیں اب کوئی چارا
فرقت میں سدا نالہ و فریاد کروں گا
اتروں گا جو منزل پہ تمھیں یاد کروں گا

صغرا نے کہا آپ کی الفت کے میں قرباں (۲۲) پھر کس کو ہو گر آپ کو لونڈی کا نہو دھیان
صدقے گئی صحت کا بھی ہو جائیگا ساماں   مولا کی توجہ ہے ہر اک درد کا درماں
جس پر نظر لطفِ مسیحِ دوسرا ہو
برسوں کا ہو بیمار تو اک دن میں شفا ہو

---

[1] صعب بالفتح دشوار یا لضم غلط ہے۔

قربان گئی اب تو بہت کم ہے نقاہت — تپ کی بھی ہے شدت میں کمی روز سے خفت
بستر سے میں خود اُٹھنے ٹہلتی بھی ہوں حضرت — پانی کی بھی خواہش ہے غذا کی بھی ہے رغبت

حضرت کی دعا سے مجھے صحت کا یقیں ہے
اب تو مرے مُنھ کا بھی مزہ تلخ نہیں ہے

کیوں روتے ہو بابا یہ تردد کی نہیں جا — سب سہل ہے کچھ مجھ کو نہیں ہونے کی ایذا
پہلے سے کہے دیتی ہوں اے سیدِ والا — میں خانۂ ویراں میں نہیں رہنے کی تنہا

اب رُوح مرے جسم میں گھبراتی ہے بابا
ان باتوں سے کچھ بوئے فراق آتی ہے بابا

مر جاؤں گی بچھڑی جو مسیح دوسرا سے — صحت مجھے ہو جائیگی حضرت کی دعا سے
کٹ جائیگا اندوہِ سفر فضل خدا سے — بیمار میں جان آئیگی جنگل کی ہوا سے

سب ساتھ ہیں رو رو نگی نہ غم کھاؤں گی بابا
لیٹی ہوئی محمل میں چلی جاؤں گی بابا

کیا تاب اگر منھ سے کہوں درد ہے سر میں — اُف تک نہ کروں بھڑکے اگر آگ جگر میں
بھولے سے بھی شب کو نہ کراہوں گی سفر میں — قربان گئی چھوڑ نہ جاؤ مجھے گھر میں

ہو جانا خفا راہ میں گر روئے گی صغرا
یاں نیند کب آتی ہے جو واں سوئیگی صغرا

وہ بات نہ ہوگی کہ جو بے چین ہو مادر — ہر صبح میں پی لوں گی دوا آپ بنا کر
دن بھر مری گودی میں رہیں گے علی اصغر — لونڈی ہوں سکینہ کی نہ سمجھو مجھے دختر

میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو
بابا مجھے فضہ کی سواری میں بٹھا دو

شہ بولے کہ واقف ہے مرے حال سے اللہ — میں کہہ نہیں سکتا مجھے درپیش ہے جو راہ

کھل جائیگا یہ راز بھی گو تم نہیں آگاہ   ایسا بھی کوئی ہے جسے بیٹی کی نہو چاہ
ناچار یہ فرقت کا الم سہتا ہوں صغرا
ہے مصلحت حق یہی جو کہتا ہوں صغرا

اے نور بھر آنکھوں پہ لے کر تجھے چلتا (۲۹) تو مجھ سے بہلتی مرا دل تجھ سے بہلتا
تپ ہے تجھے اور غم سے جگر ہے مرا جلتا   یہ ضعف کہ دم تک نہیں سینہ میں سنبھلتا
جز ہجر علاج اور کوئی ہو نہیں سکتا
دانستہ تمھیں ہاتھ سے میں کھو نہیں سکتا

تھوڑے ہی دنوں ہوئیگی کنبے سے جدائی (۳۰) پردیس سے آکر تمھیں لیجائیں گے بھائی
کی مجھ سے نہ گر کوفے کی خلقت نے برائی   ممکن ہو کہ میں اور نہ کروں وعدہ وفائی
خوش ہونگا تم اب دل پہ اگر جبر کروگی
مرجاؤں گا جب میں تو کیا صبر نہ کروگی

ثابت ہوا صغرا پہ کہ اب ہم رہے گھر میں (۳۱) بس پھر گئی تنہائی کی تصویر نظر میں
اک جوش ہوا آنسوؤں کا دیدۂ تر میں   صدمہ سے کھٹک درد کی پیدا ہوئی سر میں
شکل اپنی شب ہجر جو دکھلا گئی اس کو
کانپا یہ تن زار کہ تپ آگئی اس کو

منہ تکنے لگی ماں کا وہ بیمار بصد غم (۳۲) چتون سے عیاں تھا کہ چلیں آپ مرے ہم
ماں کہتی تھیں مختار ہیں بی بی شہ عالم   میرے تو کلیجہ پہ چھری چلتی ہے اس دم
وہ درد ہے جس درد کا چارا نہیں صغرا
تقدیر سے کچھ زور ہمارا نہیں صغرا

صغرا نے کہا کوئی کسی کا نہیں زنہار (۳۳) سب کی یہی مرضی ہو کہ مرجائے یہ بیمار
اللہ نہ وہ آنکھ کسی کی ہے نہ وہ پیار   اک ہم ہیں کہ ہیں سب پہ فدا سب کے ہیں غمخوار

بیزار ہیں سب ایک بھی شفقت نہیں کرتا
سچ ہے کوئی مُردے سے محبت نہیں کرتا

پیاری ہیں جو دو بیٹیاں جائینگی وہ ہمراہ (۳۴) کیا انس کہ ہیں گور کنارے بھی تو ہوں آہ
بابا کو نہ بہنوں کو نہ اماں کو مری چاہ — سب جیتے رہیں خیر ہمارا بھی ہے اللہ
بھولے سے نہ اب خاطر ناشاد کریں گے
ہم قبر میں جب ہونگی تو سب یاد کرینگے

کیا خلق میں لوگو کوئی ہوتا نہیں بیمار (۳۵) ہے کونسی تقصیر کہ سب ہو گئے بیزار
زندہ ہوں پہ مُردے کی طرح ہو گئی دشوار — کیوں بھاگتے ہیں سب مجھے ہے کونسا آزار
حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اسکا
وہ آنکھ چرا لیتا ہے منہ تکتی ہوں جس کا

عاشق مرے مشہور ہیں بھیا کے ہیں واری (۳۶) دو دن سے خبر بھی نہیں لی آ کے ہماری
قاسم کو غرض کیا جو سُنیں گریہ و زاری — میں کون سکینہ ہے چچا جان کو پیاری
اللہ تو ہے گر کوئی غمخوار نہیں ہے
مٹی مری کچھ قبر کو دشوار نہیں ہے

سب بیبیاں رونے لگیں سُن سُن کے یہ تقریر (۳۷) چھاتی سے لگا کر اسے کہنے لگے شبیر
لو صبر کرو کوچ میں اب ہوتی ہے تاخیر — منہ دیکھ کے چپ رہ گئی وہ بیکس و دلگیر
نزدیک تھا دل چیر کے پہلو نکل آئے
اچھا تو کہا منہ سے پہ آنسو نکل آئے

پاس آن کے اکبر نے یہ کی پیار کی تقریر (۳۸) کیا مجھ سے خفا ہو گئیں صغرا مری تقصیر
چلانے لگی چھاتی پہ منہ رکھ کے وہ دلگیر — محبوب برادر ترے قربان ہو ہمشیر
صدقے ترے سر پر سے اتارے مجھے کوئی — بل کھائی ہوئی زلفوں پہ وارے مجھے کوئی

ہاں سچ ہے کہ بیمار کا بہتر نہیں جانا (۳۹) صحت ہے جو ہیں ان میں کہاں میرا ٹھکانا
بھیا جو اب آنا تو مری قبر پہ آنا ہم گور کی منزل کی طرف ہونگے روانا

کیا لطف کسی کو نہیں گر چاہ ہماری
وہ راہ تمھاری ہے تو یہ راہ ہماری

مرنا تو مقدم ہے غم اسکا نہیں زنہار (۴۰) دھڑکا ہی کہ جب ہونگے عیاں موت کے آثار
قبلہ کی طرف کون کرے گا رخ بیمار یٰسیں بھی پڑھنے کو نہ ہوگا کوئی غمخوار

سانس اکھڑیگی جس وقت تو فریاد کروں گی
میں ہچکیاں لے لیکے تمھیں یاد کروں گی

ماں بولی یہ کیا کہتی ہو صغرا ترے قرباں (۴۱) گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جاں
بیکس مری بچی ترا اللہ نگہباں صحت ہو تجھے میری دعا ہے یہی ہر آں

کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا
جینے کے لئے جان کو کھوتے نہیں بیٹا

میں صدقے گئی بس نہ کرو گریۂ و زاری (۴۲) اصغر مرا روتا ہی صدا سن کے تمھاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری آ آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری

چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان سے گئے تم
اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی (۴۳) تڑپے تمھیں چھاتی سے بھی لپٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے وہ لب پہ سخن لا نہیں سکتی دکھ لوں تمھیں اماں کو میں سمجھا نہیں سکتی

بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمھیں طاقت گفتار نہیں ہے

معصوم نے جس دم یہ سنی درد کی گفتار (۴۴) صغرا کی طرف ہاتھوں کو لٹکا دیا اکبار

لے لے کے بلائیں یہ لگی کہنے وہ بیمار (۴۴) جھک جھک کے دکھاتے ہو مجھے آخری دیدار
دنیا سے کوئی دم میں گزر جائے گی صغرا
تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ مر جائے گی صغرا

عباسؑ نے اتنے میں یہ ڈیوڑھی سے پکارا (۴۵) چلنے کے لئے قافلہ تیار ہے آقا
لپٹا کے گلے فاطمہ صغرا کو دوبارا اُٹھے شہِ دیں گھر تہ و بالا ہوا سارا
جس چشم کو دیکھا سو وہ پُرنم نظر آئی
اک مجلس ماتم تھی کہ برہم نظر آئی

بیت الشرف خاص سے نکلے شہِ ابرار (۴۶) روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترت اطہار
فراشوں کو عباس پکارے یہ بہ تکرار پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار
باہر حرم آتے ہیں رسول دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکوں سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اُتر جائے (۴۷) آتا ہو ادھر جو وہ اسی جا پہ ٹھہر جائے
ناقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گزر جائے دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے
مریم سے سوا حق نے شرف اُنکو دیے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کئے ہیں

عباس علی سے علی اکبرؑ نے کہا تب (۴۸) ہیں قافلہ سالار حرم حضرت زینب
پہلے ہوں وہ اسوار تو محمل میں چڑھیں سب حضرت نے کہا ہاں یہی میرا بھی ہے مطلب
گھر میں مرے ماں کی جگہ بنت علی ہے
میں جانتا ہوں ماں مرے ہمراہ چلی ہے

زینت دہِ محمل جو ہوئی دختر زہرا (۴۹) ناقوں پہ چڑھے سب حرم سید والا
آنے لگے رہوار دکھا گرد کا پردا عباس سے بولے یہ شہ یثرب و بطحا

صدمہ ہے بچھڑنے کا مرے روح نبی پر
رخصت کو چلو قبر رسول عربی پر

ہے قبر پہ نانا کی مقدم مجھے جانا   کیا جانیے پھر ہو کہ نہ ہو شہر میں آنا
اماں کی ہے تربت پہ ابھی اشک بہانا   اس مرقد انوار کو ہے آنکھوں سے لگانا
آخر تو لئے جاتی ہے تقدیر وطن سے
چلتے ہوئے ملنا ہے ابھی قبر حسن سے

پیدل شہ دیں روضۂ احمد کو سدھارے   تربت سے صدا آئی کہ آ میرے پیارے
لحد سے شبیر لپٹ کر یہ پکارے   ملتا نہیں آرام نواسے کو تمہارے
خط کیا ہیں اجل کا یہ پیام آیا ہے نانا
آج آخری رخصت کو غلام آیا ہے نانا

خادم کو کوئی امن کی اب جا نہیں ملتی   راحت کوئی ساعت مرے مولا نہیں ملتی
دکھ کون سا اور کونسی ایذا نہیں ملتی   ہیں آپ جہاں راہ وہ اصلا نہیں ملتی
پابند مصیبت ہوں گرفتار بلا ہوں
خود پاؤں سے اپنے طرف قبر چلا ہوں

میں اک تن تنہا ہوں ستمگار ہزاروں   اک جان ہے اور درپئے آزار ہزاروں
اک پھول سے رکھتے ہیں خلش خار ہزاروں   اک سر ہے فقط اور خریدار ہزاروں
واں جمع کئی شہر کے خونریز ہوئے ہیں
خنجر مری گردن کے لئے تیز ہوئے ہیں

فرمائیے اب جائے کدھر آپ کا شبیر   یاں قید کی ہے فکر ادھر قتل کی تدبیر
تیغیں ہیں کہیں میرے لیے اور کہیں زنجیر   خونریزی کو کعبہ تلک آپہونچے ہیں بے پیر
بچ جاؤں جو پاس اپنے بلا لیجیے نانا   تربت میں نواسے کو چھپا لیجیے نانا

فرما کے یہ رو دیا کیے شہ سر کو جھکائے   واں سے جو اٹھے فاطمہ کی قبر پہ آئے
پائینِ لحد گر کے بہت اشک بہائے   آواز یہ آئی کہ میں صدقے مرے جائے
ہی شور ترے کوچ کا جس دن سے وطن میں
پیارے میں اسی دن سے تڑپتی ہوں کفن میں

پہلو میں جو تھی فاطمہ کے تربت شبرؑ   اس قبر سے لپٹے بہ محبت شہِ صفدر
چلائے کہ شبیرؑ کی رخصت ہے برادر   حضرت کو تو پہلو ہوا اماں کا میسر
قبریں بھی جدا ہیں تہِ افلاک ہماری
دیکھیں ہمیں لیجائے کہاں خاک ہماری

یہ کہکے چلے قبر حسن سے شہِ مظلوم   رہوار جو مانگا تو سواری کی ہوئی دھوم
یارانِ وطن گرد تھے افسردہ و مغموم   چلاتے تھے خادم کہ چلا خلق کا مخدوم
خالی ہوا گھر آج رسولِ عربی کا
تابوت اسی دھوم سے نکلا تھا نبی کا

تھا ناکے تلک شہر کے اک شور قیامت   سمجھاتے ہوئے سب کو چلے جاتے تھے حضرت
رو رو کے وہ کہتا تھا جسے کرتے تھے رخصت   پائینگے کہاں ہم یہ غنیمت ہے زیارت
آخر کو بچھڑ کر کفِ افسوس ملیں گے
دس بیس قدم اور بھی ہمراہ چلیں گے

قسمیں انھیں دے دیکے کہا شہ نے کہ جاؤ   تکلیف تمھیں ہوتی ہے اب ساتھ نہ آؤ
اللہ کو سونپا تمھیں آنسو نہ بہاؤ   بچھڑتے کے ہیں ہم سے بس اب ہاتھ اٹھاؤ
اُس بیکس و تنہا کی خبر پوچھتے رہنا
یارو مری صغرا کی خبر پوچھتے رہنا

روتے ہوئے وہ لوگ پھرے شاہ سدھارے   جو صاحب قسمت تھے وہ ہمراہ سدھارے

کس شوق سے مردانِ حق آگاہ سدھارے عابد طرف خانۂ اللہ سدھارے
اترے نہ مُسافر کسی مخلوق کے گھر میں
عاشق کو کشش لے گئی معشوق کے گھر میں

(۱۹) لشکر یزید کے ایک پہلوان کی تصویر

(حریف مخالف اگر حقیر اور ذلیل ثابت کیا جائے تو اس پر فتح پانے کی عزت گھٹ جاتی ہے اور اگر اس کی تعریف کی جائے تو مذہب مانع ہوتا ہے ایسے مشکل موقع پر یہ دونوں شہنشاہان سخن حسب ذیل طرز اختیار کرتے ہیں)

دبیر

سرتا بقدم زہر، زباں سانپ، دہن غار شعلہ تھی نگہ۔ آنکھ تھی تنور شرربار
نخوت تھی وہ تیوری میں کہ تھے اپنے بھی بیزار تلوار دھرے چہرے پہ خود بینیٔ غدار
اشتر پہ وہ ناری تھا کہ شعلہ بھی دھواں تھا
یا ریت کا پشتہ تھا کہ جادو سے رواں تھا

فولاد کے قلعے میں چھپائے ہوئے سر کو باندھے ہوئے زنجیر کے پٹکے سے کمر کو
دو جلتوں میں نسواس سے پنہاں کئے سر کو اندھیر کی نیت میں لئے منہ پہ سپر کو
لڑنے میں کماں چھوٹتی تھی ساتھ سے اُسکے
آرام نہ تھا چرخ کو بھی ہاتھ سے اُسکے

انیس

سرطبلک معکوس جبیں حد سے فزوں تنگ غدار، ملیح شور و جفا پیشہ و سرہنگ
کہنے کو بشر، پر قد و قامت کا نیا ڈھنگ حیراں شب ظلمات ہو یہ تیرگی رنگ
پہلے سے یہ کالا تھا منہ اس دشمن رب کا
بنجائے تو اعکس سے آئینہ حلب کا

لال آنکھیں وہ ظالم کی وہ منھ قبر سا کالا
شب ایک طرف دن کو ڈرے دیکھنے والا
قد دیو کی قامت سے بلندی میں دو بالا
دانتوں کی کبودی دہن مار کا چھالا
شیر اسکی صدا سن کے لرز جاتے تھے بن میں
فاسد تھی ہوا ان کی وہ بدبو تھی دہن میں

بالا قد و کلفت و تنومند و خیرہ سر
روئیں تن و سیاہ دروں آہنی کمر
ناوک پیام مرگ کے ترکش اجل کا گھر
تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر
دل میں بدی طبیعت بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

نکلا یہ سن کے غیظ میں اک پہلوان روم
گیتی کے چار دانگ میں تھی جس شقی کی دھوم
مرہنگ و پر غرور و سیہ قلب و نحس و شوم
لنگر سے جس کے ہل گئی مقتل کی مرزبوم
مرحب تھا کفر و شرک میں طاقت میں گیو تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ پہاڑی پہ دیو تھا

(۲۰) امام مظلوم کی بےکسی

دبیرؔ

مومنو بے کس و بے یار ہے مظلوم حسین
سخت آفت میں گرفتار ہے مظلوم حسینؑ
کیا سراسیمہ و ناچار ہے مظلوم حسین
دل شکستہ جگر افگار ہے مظلوم حسینؑ
تیر کے کاری ہیں لگے زخم ہیں شمشیروں کے
نیزوں کے زخموں میں پیوستہ ہیں پھل تیروں کے

سینہ زخمی ہے بدن زخمی کلیجا زخمی
انگلیاں زخمی ہیں اور ساعد زیبا زخمی
ہونٹ زخمی ہیں گلا زخمی ہے ماتھا زخمی
نام کس عضو کا لوں میں ہے سراپا زخمی
ایسے زخمی کو تو کافر بھی پلائیں پانی
حیف سید سے مسلماں بھی چھپائیں پانی

دل کا یہ حال ہے پژمردہ ہوا جاتا ہے　　ایک دریا ہے کہ زخموں سے بہا جاتا ہے
ایک دم میں جو کئی بار غش آجاتا ہے　　کوئی برچھی کوئی تلوار لگا جاتا ہے
تیر ایک ایک جگر میں جو قریب دل ہے
سانس کی آمد و شد سینے میں کیا مشکل ہے

تن سے گر کھینچتے ہیں ایک بھی پیکاں شبیر　　اتنے عرصہ میں لگاتے ہیں عدو سیکڑوں تیر
کھا کے تیروں کو اگر کرتے ہیں قصد تکبیر　　پاس سے نیزے لگاتے ہیں دہن پر بے پیر
ایک پیکان جو سینے سے گزر جاتا ہے
خون کے روکنے کو دوسرا تیر آتا ہے

کیا رحیمی ہے کہ غصہ نہیں آتا ہے ذرا　　کیا کریمی ہے کہ سر کرتے ہیں امت پہ فدا
کیا تحمل ہے کہ ہر زخم پہ ہے شکر خدا　　کیا شجاعت ہے کہ لاکھوں میں کھڑے ہیں تنہا
تیر بھی نیزے بھی سینے پہ لئے جاتے ہیں
پر دعا نانا کی امت کو دیئے جاتے ہیں

انیس

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے　　ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے
اس طرف لشکر اعدا میں صف آرائی ہے　　یاں نہ بیٹا نہ بھتیجا نہ کوئی بھائی ہے
برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
"مارو پیاسے" کو ہے شور ستمگاروں میں

غول میں ترپیچ عمامے کے ہیں سر زخمی　　ہے جبیں چاند سی پرنور مگر زخمی ہے
سینہ سب برچھیوں سے تا بہ کمر زخمی ہے　　تیر بیداد سے دل زخمی جگر زخمی ہے
زخم شمشیر سے بیکار ہیں بازو دونوں
ظلم کے تیر سے مجروح ہیں پہلو دونوں

برچھی آکر کوئی پہلو پہ لگا جاتا ہے — مارتا ہے کوئی نیزہ تو غش آجاتا ہے
بڑھتے ہیں زخم بدن زور گھٹا جاتا ہے — بند آنکھیں ہیں سر پاک جھکا جاتا ہے
گرد زہرا و علی گریہ کناں پھرتے ہیں
غل ہے گھوڑے سے امام دو جہاں گرتے ہیں

لاکھ شمشیر ہیں اور ایک تن اطہر ہے — ایک مظلوم ہے اور ظالموں کا لشکر ہے
سیکڑوں خنجر فولاد ہیں اور اک سر ہے — نہ کوئی یار نہ ہمدم نہ کوئی یاور ہے
باگ گھوڑے کی لٹکتی ہے اٹھا سکتے نہیں
سامنے اہل حرم روتے ہیں جا سکتے نہیں

اقتباسات کا سلسلہ طویل ہو گیا۔ اب صرف ایک شعر اور سن لیجئے۔

دبیر

انصاف کہاں سے ہو کہ دل صاف نہیں — دل صاف کہاں سے ہو کہ انصاف نہیں

انیس

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں — اس دہر میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں

مغربی سادگی کے دلدادہ کہیں گے کہ سعدی و فردوسی کو اگر جامی و نظامی پر ترجیح ہے۔ شیکسپیر کی منزلت اگر ملٹن سے زیادہ ہے تو انیس کا مرتبہ دبیر سے بلند ہے اور وہ اس تحسین اور ستایش کا خراج وصول کرنے کے مستحق ہیں، جو بیسوی صدی عیسوی میں ہندوستان کے ہر گوشہ سے ان کے کلام پر نثار کیا جاتا ہے۔

مشرقی نازک خیالی کے فدائی اصرار کریں گے کہ انیس و دبیر سپہر سخنوری کے شمس و قمر تھے۔ جَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاساً وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشاً۔ دنیا کو دونوں کی ضرورت تھی۔

اور ان سا کوئی غرب سے تا شرق نہیں ہے
دو ٹکڑے ہیں اک سیب کے کچھ فرق نہیں ہے

فقیر امیر کا مشرب صلح کل۔ با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام۔ وہ دونوں کا ہم زبان بن جاتا ہے مگر (دبیریوں کی نظر بچا کر) اس کا عقیدہ یہی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا۔

انیسؔ اب تو ہلال و بدر کو یکساں سمجھتے ہیں
رہی ہے منصفوں میں قدر یہ صاحب کمالوں کی

بزرگان ملک نے یہ رسم بنا لی ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کی سوانح عمری لکھتے ہیں تو اس کے کلام کا دوسرے مشاہیر سے مقابلہ کر کے اپنے ہیرو کی ترجیح ثابت کرتے ہیں۔

بعض برادران وطن نے یہ ظلم شروع کیا ہے کہ اپنے ممدوح کے چست و بلند کلام کا حریفوں کے سست و پست سخن سے موازنہ کر کے زندو قیا کا مرتبہ مرزا دبیر سے بڑھا دیتے ہیں۔ تقابل کلام ادب کے لئے مفید ہو بشرطیکہ انتخاب دیانت سے کیا جائے اور جن اساتذہ کے رشحات قلم سے موازنہ منظور ہو تو ان کے متحد المضامین اشعار نقل کر دیے جائیں۔ مشک کی بو چھپ نہیں سکتی اہل نظر خود امتیاز کر لیں گے کہ کس کا مرتبہ اعلیٰ ہے۔

یہ اصول پیش نظر رکھ کر اس تالیف میں کلام انیسؔ کی لطافتیں، نزاکتیں دکھانے اور منطق و فلسفہ کے دلائل سے میرؔ صاحب کا پلہ گراں تر ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ میرؔ صاحب اور ان کے حریف مقابل مرزا دبیر کے متحد المضامین اشعار درج کر دیے ہیں اور میرؔ صاحب کا تفوق ثابت کرنے کے بہانے سے کتاب کا حجم نہیں بڑھایا ہے۔

خورشید کو کچھ حاجتِ زیور نہیں زنہار
پھولوں پہ کوئی عطر لگائے تو ہے بیکار

ہندوستان میں مرثیہ کی عہد بعہد ترقی کا ایک اجمالی خاکہ ناظرین کے سامنے پیش کر دیا گیا اور ہر دور کے بعض شعرا کا کلام بھی بطور نمونہ درج کیا گیا۔ جس سے ثابت ہو گیا کہ اس ملک میں مرثیہ ابیات سے شروع ہوا پھر مربع کہا گیا۔ سکندر و سودا نے مسدس کا آغاز کیا۔ میر ضمیر نے رزم دوسرا پایا مرثیوں میں شامل کیا۔ اور غلط الفاظ جن کا استعمال بیان مصائب میں جائز سمجھا جاتا تھا ترک کیے۔ میر انیس نے اس فن کو معراج کمال تک پہنچا دیا اور مرثیہ گوئی کو حقیقی شاعری بنا دیا۔ ادبی حیثیت سے اس صنعت سخن کو خوب عروج ہوا مگر مورخ کی نظر میں ترقی معکوس ہوئی بچپن میں جو سادگی اور صحت روایات کا التزام تھا عنفوان شباب میں باقی نہ رہا اور جوانی کے وقت ضعیف اور موضوع حکایات کا گہنا اسقدر پہنایا گیا کہ اصلی خط و خال بھی چھپ گئے۔ مرثیہ کا مقصود محبان حسین کو رلانا تھا اور ایک ہی قسم کی روایات بار بار سنتے سنتے عزاداروں کے آنسوؤں کا خزانہ خشک ہو گیا تھا ضرورت تھی کہ کتب واحادیث و مقاتل سے غیر مشہور حکایتیں تلاش کی جائیں اور ان پر شاعری کا روغن چڑھا کر مجالس میں گرمی پیدا کی جائے من بکی او ابکی او تباکی کا فرمان شعرائے لکھنؤ کی چشم عقیدت کا سرمہ تھا۔ غم حسین میں رونا رلانا داخل عبادت سمجھ کر انھوں نے ہر ایک دردانگیز روایت کو بے تکلف نظم کرنا شروع کیا اور اس تحقیق کی کوشش نہیں کی کہ کون سی روایت ضعیف ہے اور کون سی موضوع۔ زعفر جن ابوالحارث آہوان حسین اور شہزادی حلب وغیرہ کے افسانے جن پر زمانہ حال کے تعلیمیافتہ اعتراض کرتے ہیں انہی

سلسلہ میں نظم ہو گئے۔ راویوں کی جرح و تعدیل علم حدیث کا دشوار ترین شعبہ ہے ایک ہی راوی کو بعض علما ثقہ اور متدین اور دوسرے مبتدع اور وضاع بتاتے ہیں اور اگر شعرا، اپنا وقت عزیز تحقیق رواۃ میں صرف کرتے تو "سیرت اور رجال" کو شاید فائدہ پہونچتا لیکن شاعری رخصت ہو جاتی اور جو سرمایہ دلکش نظموں کا آج ہمارے پاس موجود ہے عالم وجود میں نہ آتا دیکھئے امام حسین کا مجبور ہو کر اپنی عزیز بیٹی کو بیماری کی حالت میں تنہا خانہ ویرانی میں چھوڑنا نہایت ضعیف روایت ہے اگر یہ حکایت نظم نہ کی جاتی تو اُردو شاعری اس بے نظیر بیت سے محروم رہ جاتی جو حضرت صغرا کی زبان سے میر صاحب نے ادا کی ہے ؎

حیرت میں ہوں باعث مجھے کھُلتا نہیں اسکا
وہ آنکھ چرُالیتا ہے منھ تکتی ہوں جس کا

اسی طرح حضرت شہر بانو کا معرکۂ کربلا میں موجود ہونا روایات صحیحہ سے ثابت نہیں۔ اگر سخن سنج اس قصہ کی تحقیق شروع کرتے تو وہ بے شمار اشعار جو "رخصت امام از اہل حرم" کے موقع پر شعرا نے ان کی زبان سے ادا کیے ہیں۔ نظم اُردو کو نصیب نہ ہوتے۔ حضرت قاسم کی میدان کربلا میں شادی مسلمانوں کا ایک گروہ بے بنیاد قرار دیتا ہے اگر اس حکایت کے نظم کرنے سے احتراز کیا جاتا تو درد انگیز اشاروں کا وہ لازوال گنجینہ نصیب نہ ہوتا۔ جو اسی قصہ کی بدولت دستیاب ہوا ہے۔ ضمیر کا مصرع۔ دست بریدہ ہیں کہیں کنگنا بندھا ہوا اُردو زبان کو میسر نہ آتا اور میر انیس نہ کہہ سکتے ؎

کیا جانے ہوگا قریب کیا حال باپ کا
جی لگ گیا عروس کی باتوں میں آپ کا

حضرت شہر بانو کی آزاد کردہ کنیز شیریں کا قصہ نہایت مشتبہ ہے لیکن نظم اُردو کو روایت کے طفیل میں یہ شعر نصیب ہوا ؎

جام شربت کے بھرے ابن حسن کی جا خاطر
گہنا پھولوں کا دکھا لاکے دلہن کی خاطر

حضرت سکینہ کا زندان شام میں وفات پانا یقیناً غلط ہے لیکن مرزا دبیر کا مشہور مرثیہ ع جب قبر سکینہ پہ حرم آئے سوم کو۔ اسی حکایت کی بنا پر سوز و گداز کی تصویر بنا۔ مورخ کی نگاہ میں شہنشاہان سخن کی یہ کمزوری کتنی ہی معیوب ہو لیکن نظم اُردو جواہرات کی ان قیمتی لڑیوں پر ہمیشہ ناز کرتی رہے گی اور شاعری کی سرکار سے مرثیہ گویان لکھنؤ اس قصور پر ہدف اعتراضات کبھی نہ بنائے جائیں گے کہ انھوں نے ضعیف اور موضوع روایات کو نظم کیا اگر ایک امر محال کو شاعر نے ممکن فرض کرلیا اور اس خود ساختہ عالم میں اپنی سحر طرازی کا جلوہ دکھایا تو نقادان سخن کو اس اعتراض کا کوئی منصب نہیں کہ جدید عالم امکان کیوں بنایا گیا البتہ اگر اس نو ایجاد دائرہ میں شاعر کا کوئی بیان مقتضائے حال کے خلاف ہو تو اس کی قادر الکلامی پر اعتراض کیا جائے گا۔ مرثیہ گویوں نے غلط روایتیں نظم کیں۔ لکھنؤ کے شادی وغمی کے رسوم عرب پر منطبق کیے۔ جوہی اور بیلے کے پھول عراق کے جنگل میں بچھا دیے۔ یہاں تک تو مضائقہ نہ تھا لیکن غضب یہ کیا کہ اہل مجلس کو رُلانے کے شوق میں بعض موقعوں پر حضرت امام اور ان کے اہل حرم کے اصلی کیرکٹر پر بھی پردہ ڈال دیا۔ اُن کی زبان سے ایسے الفاظ ادا کرا دیے جن سے بے صبری اور شکوے شکایت کی بُو آتی ہے۔ وہ سب کے سب میدان رضا و تسلیم کے شہسوار تھے اور اہل حدیث کے قول کے مطابق کربلا کا معرکہ

عشاق کے صبر و تحمّل کا امتحان تھا۔

جب عاشق امتحان صبر و وفا میں کامل نکلا تو معشوق خود عاشق بن گیا اور آج دنیا میں اس داستان عشق و محبّت کی وہ شہرت ہے جو کائنات عالم کے کسی ہنگامے کو خواب میں بھی نصیب نہ ہوئی۔ گریۂ وزاری تو بڑی چیز ہو اگر حضرت کے دل مبارک پر میل بھی آتا تو دنیا کا تختہ اُلٹ جاتا دشمنوں کی کیا مجال تھی کہ وہ آپ کو قتل کر سکتے یا اہل حرم کو تاراج کرنے کی جرأت کرتے افسوس ہے کہ اس برگزیدۂ عالم کی زبان سے مرثیہ گویوں نے ایسے اضطراب اور بے صبری کے کلمات کہلائے جو ان کے غلامان غلام پر بھی زیب نہیں دیتے میر انیس نے جناب امام علیہ السلام کے صبر و رضا اور شوق شہادت کا بیان نہایت ہی پُر اثر اور بلند الفاظ میں کیا تاہم اس رسم دیرینہ کو وہ قطعاً ترک نہ کر سکے اور ان کے کلیات میں بھی بعض جگہ ایسے خلاف شان کلمات پائے جاتے ہیں جو نہ ہوتے تو بہتر تھا۔

یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے کہ "کربلا کی لڑائی" رزمیہ نظم کے لئے مناسب مضمون بھی یا نہیں مرثیہ گویوں نے معرکۂ جنگ اس زور و شور سے بیان کیا کہ الفاظ سے دل پر ہیبت طاری ہوتی ہے۔ لڑائی کے تمام ساز و سامان آلات و اسلحہ تفصیل سے لکھے۔ حریفوں کے داؤں پیچ بھی خوب دکھائے۔ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ دنیا کی کوئی مشہور رزمیہ نظم ایسی نہیں جس میں شاعر کے ہیرو کو شکست ہوئی۔ یونان کے قدیم ایپک الیڈ شاعر کے ہم قوموں کی فتح کی داستان ہے۔ آڈیسی اس کے ایک ہم وطن کی بحری کامیابیوں کا ترانہ ہے۔ راماین راجہ رام چندر کی فتحمندی کا نغمہ ہے۔ مہابھارت سری کرشن جی کی امداد سے اُنکے دوستوں کی کامیابی کا راگ ہے

سکندر نامہ میں نظامی کا ہیرو ہر معرکہ میں سرخرو ہوتا ہے۔ شاہنامہ میں رستم ہر ایک مہم کو سر کرتا ہے۔ حملۂ حیدری میں حضرت اسد اللہ الغالب کے فتوحات کی روایت ہے اور انگلستان کی مشہور نظم پیریڈ ایز لاسٹ میں اگرچہ بیان رزم بہت مختصر ہے مگر جس قدر ہے اس کا انجام حق کی ظفر ہے۔

کربلا کی لڑائی نہ تو مہابھارت کے سے وسیع پیمانہ پر تھی اور نہ اس سے دنیا کی تاریخ میں جنگ سکندر و دارا کی طرح فوراً کوئی انقلاب پیدا ہوا۔ بلکہ ظاہرا باطل نے حق پر غلبہ پایا اور ایک مدت کے لیئے حق پرستوں کی طاقت بالکل زائل ہو گئی اس دردناک انجام پر غم کرنا آنسو بہانا واجب ہی اور مرثیہ گویوں کیلیئے یہ بہترین مضمون ہی لیکن حرمان و حسرت کے علاوہ اور بھی بہت سے انسانی جذبات کی تصویر رزمیہ نظموں میں کھینچی جاتی ہے جو مرثیوں میں کسی طرح شامل نہیں ہو سکتی۔ زمانہ حال کے تعلیمیافتہ اردو شاعری میں ایک اپیک کا موجود نہ ہونا اپنے ملکی زبان کے چہرہ پر ایک نہایت بدنما داغ تصور کرتے اور کلیات دبیر و انیس سے اشعار انتخاب کر کے ایک مسلسل رزمیہ نظم تیار کرنا چاہتے ہیں بیشک مرثیہ گویان لکھنؤ کے کلام سے سیکڑوں شعر ایسے تلاش کیئے جا سکتے ہیں جن کا جواب فردوسی اور نظامی کے کلیات میں مل سکے تاجداران کشور سخن کیلیئے ایک مسلسل نظم بھی لکھدینا چنداں دشوار نہ تھا مگر وہ غالباً بیسوی صدی کے روشن خیالوں سے زیادہ دور اندیش تھے اور انھوں نے پہلے ہی دریافت کر لیا تھا کہ واقعۂ کربلا کا بیان رزمیہ نظم کا موضوع بنانے کے لیئے مناسب نہیں اسلیئے اپنا جوہر کمال دکھانے کے لیئے انھوں نے رزمیہ شاعری کے تمام شرائط جمع کر دیے لیکن شاہنامہ و سکندر نامہ کا جواب نہیں لکھا اور مسلسل نظم تیار نہیں کی۔

غرض مرثیہ کا مقصود نہ تاریخ نویسی ہے اور نہ بیان رزم وہ حسرت درد و غم کے جذبہ کو حرکت دینے کا آلہ ہے اور اس حیثیت سے میر انیس اور انکے ہم عصروں

نے جو کچھ کہا خوب کہا۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ!!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے — بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا — جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

نام و نسب | انیس تخلص۔ میر ببر علی نام۔ خاندان سیادت سندی تھا اور شاعری گھرانے میں میراث چلی آتی تھی ان کے اجداد میں سے میر امامی موسوی شاہجہاں کے عہد میں ہرات سے دلی آئے۔ فاضل متبحر اور فقیہ بے مثل تھے۔ شعر و سخن سے بھی ذوق رکھتے تھے۔ جوہر شناس بادشاہ کی شرفا پروری سے سہ ہزاری منصب پایا اور اسی ملک میں آباد ہو گئے۔

چار پشتوں تک یہ خاندان دلی میں ممتاز رہا۔ جب سلطنت مغلیہ کا آفتاب اقبال لب بام آیا شرفا نوازی کا کال ہوا۔ میر امامی کے پر پوتے غلام حسین ضاحک تھے جو مرزا رفیع سودا کے ہم عصر۔ نہایت خوش طبع۔ زندہ دل اور

لہ غلام حسین ضاحک بن عزیز اللہ بن برات اللہ بن میر امامی ہروی۔ مولوی محمد حسین آزاد نے میر ضاحک کو میر تقی و مرزا رفیع سودا کی صف میں جگہ دی ہے لیکن اپنے تذکرہ آب حیات میں صرف ایک ہی شعر ان کا درج کیا ہے ؎

کیا دیجیے اصلاح خدا کو دگر نہ — کانی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا

ان کے باکمال صاحبزادے میر حسن تحریر فرماتے ہیں کہ "قبلہ گاہی صاحب سلمہ اللہ تعالی باین ہمہ قدرت علم چوں طبایع ساحاں را در خور سخن بلند نیافتہ بقدر حوصلہ آنہا بطرف ہزل توسن قلم میرانند بحکم آنکہ" زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز۔ لیکن زبان عجیب و غریب طرح کردہ اند کہ از آدم تا ایں دم کسے نہ گفتہ چنانچہ یک مطلع ترقیم می نماید۔

یا ایہا الناس کہ کرد بیان جھلانکہ — کل تو پچی پرابیہ قسر د بکا سرہ"

فرخندہ جبیں تھے۔ حوادث روزگار سے ترک وطن پر مجبور ہوئے اور اپنے خلف الرشید میر حسن کو ساتھ لے کر جن کی عمر صرف اس وقت بارہ سال کی تھی نواب وزیر اودھ کے سایۂ عاطفت میں فیض آباد پہونچے۔ شجاع الدولہ نواب وزیر کی محل خاص امۃ الزہرا بیگم[1] نے اس وقت فیض آباد کو دلی کا ایک محلہ بنا رکھا تھا ان کی فیاضی اور سیر چشمی ضرب المثل تھی۔ دلی کا ادنیٰ اور اعلیٰ جو آتا اس کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتی تھیں۔ آوارہ وطن سادات کی خاطر مدارات تعظیم و تکریم ہوئی اور یہ خانوادہ فضل و کمال فیض آباد میں آباد ہوگیا۔

شجاع الدولہ کی وفات کے بعد نواب آصف الدولہ مسند نشین ہوئے۔

۱؎ یہ موتمن الدولہ نواب محمد اسحاق خاں شوستری کی بیٹی تھیں۔ رنگیلے بادشاہ محمد شاہ نے ان کو اپنی بیٹی بنایا تھا اور شجاع الدولہ کے ساتھ شادی کی تھی جہیز میں شاہانہ ساز و سامان دیا۔ سسرال سے "بہو بیگم" اور "خاص محل" کا خطاب ملا۔ نواب آصف الدولہ اُن کے اکلوتے بیٹے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۷) تاریخ وفات معلوم نہیں لیکن صاحب تذکرہ گلزار ابراہیمی ۱۱۹۶ھ میں کہتے ہیں کہ میر ضاحک فیض آباد میں ہیں اور آزادگی سے گذران کرتے ہیں۔ یہ مسلم ہے کہ میر ضاحک کا انتقال میر حسن سے پہلے ہوچکا تھا۔ آب حیات میں ہے "میر ضاحک کا انتقال ہوا تو سودا فاتحہ کیلئے گئے اور دیوان اپنا ساتھ لیتے گئے۔ بعد رسم عزا پرسی کے اپنی زیادہ گوئی پر جو کہ اس مرحوم کے حق میں کی تھی بہت سے عذر کیے اور دیوان منگا کر جو ہجویں انکی کہی تھیں سب چاک کر ڈالیں۔ میر حسن نے بمقتضائے علو و صلہ سعادتمندی اسی وقت دیوان باپ کا گھر سے منگوایا اور جو ہجویں اُن کی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں۔"

میر حسن نے عشرہ اول ماہ محرم ۱۲۰۱ھ بعہد نواب آصف الدولہ بہادر وفات پائی اور مفتی گنج لکھنؤ میں نواب قاسم علی خاں کے باغ کے پچھواڑے دفن ہوئے۔ لہذا یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ میر ضاحک نے ۱۱۹۶ھ اور ۱۲۰۰ھ کے درمیان انتقال فرمایا اور آپ کا مدفن بھی غالباً لکھنؤ ہے ۱۲۔

ان کا فیض آباد میں دل نہیں لگا۔ اپنی ماں "بہو بیگم" کی روک ٹوک سے گھبرا کے شکار کے بہانے فیض آباد سے لکھنؤ آگئے اور یہیں محل سرائیں باغات اور بازار تیار کرا کے رہ پڑے۔

مرکز حکومت لکھنؤ مقرر ہوا تو تعلقات شاہی کی وجہ سے میر ضاحک اور میر حسن کی آمد و رفت لکھنؤ میں جاری ہوئی اور مثنوی سحرالبیان کا فخر وزگار مصنف اسی زمین کا پیوند ہوا۔ استاد وقت مصحفی نے "شاعر شیریں زبان" مادۂ تاریخ وفات نکالا۔

اس ثنا خواں کے بزرگوں میں ہیں کیا کیا مداح   جد اعلیٰ سے نہ ہوگا کوئی اعلیٰ مداح

باپ مداح کا مداح ہے دادا مداح   عم ذیقدر ثنا خوانوں میں یکتا مداح

جو عنایات الٰہی سے ہوا نیک ہوا

نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

میر حسن کے تین بیٹے شاعر تھے جن میں سے میر مستحسن، خلیق اور میر محسن محسن آصف الدولہ بیگم کی سرکار سے تعلق رکھتے تھے اور میر احسن خلق نواب علی خاں کی خدمت میں حاضر باش تھے۔ ان سب کا قیام فیض آباد میں رہتا تھا اگرچہ ضروریات کبھی کبھی لکھنؤ جانے پر مجبور کرتی تھیں خلیق اپنے پدر عالی قدر کے ارشاد کے مطابق ۱۹ سال کی عمر میں شیخ مصحفی کے شاگرد ہوئے اور اس "شاگرد" استاد نے اپنے تذکرہ میں خلیق کی شاگردی کا فخر و مباہات سے ذکر کیا ہے انھوں نے کچھ عرصہ تک عاشقانہ غزل گوئی کی مشق کی اور ایک مشاعرہ میں جہاں خواجہ آتش بھی تشریف رکھتے تھے غزل پڑھی جس کا مطلع تھا:۔

رشک آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو   صاف ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو

آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص فیض آباد میں موجود ہے تو میری کیا ضرورت ہے۔ وہ صاحب دیوان تھے مگر اسے رواج نہیں دیا۔ مرثیہ گوئی شروع کی اور سرمایۂ مضامین جو بزرگوں سے ورثہ پہونچا تھا وہ زاد آخرت میں صرف کر دیا۔ ان کی نیک نیتی پھل لائی، خدا نے تین باکمال فرزند انیس۔ مونس۔ اُنس عطا کئے جن میں سے خلف اکبر آفتاب بن کر چمکے اور سارے گھر میں اُجالا کر دیا ورنہ آج میر حسن کے سوا اس خانوادۂ سیادت میں سے کسی کا نام روشن نہ ہوتا۔

پیدائش اور طفولیت | ۱۲۱۶ھ میں نواب سعادت علی خاں اودھ کی حکومت پر رونق افروز تھے محلہ گلاب باڑی شہر فیض آباد میں انیس کی ولادت ہوئی اس زمانہ میں میر خلیق عسرت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اُمرا و اعیان ریاست لکھنؤ میں تھے۔ فیض آباد اُجڑ رہا تھا۔ وہ ہر سال مرثیوں کا جزدان بغل میں لے کر لکھنؤ جاتے۔ میر بنجارا میں قیام کرتے۔ تین چار سو روپیہ حاصل کر کے لاتے اور پرورش عیال پر صرف کرتے تھے۔ صاحبزادے کے پیدا ہوتے ہی کاشانۂ سیادت روشن ہو گیا۔ صورت کا رعب و داب دیکھ کر ببر علی نام رکھا اور شکر الٰہی بجا لائے۔ فیض آباد میں ایک ادبی دفتر محاورات اصطلاحات و ضرب الامثال اُردو کی تدوین کا قائم تھا۔ میر حسن مرحوم اسی دفتر کے میر منشی رہے تھے۔ اب یہ خدمت میر خلیق کے سپرد ہوئی جب کوئی جدید محاورہ محلات سے تراش کر نکلتا۔ دفتر میں قلمبند ہوتا جب گھرانے میں اس کی تحقیق و تنقید ہوتی تھی اسی میں اس مولود مسعود نے آنکھیں کھولیں۔ خورشید کمال اپنے انتہائی عروج کے وقت بھی اس قیمت

(۱) آب حیات دور پنجم۔ میر مستحسن خلیق

خداوندی پر فخر کرتا۔ اور جب اسکی محاورہ بندی یا روزمرہ پر کوئی معترض ہوتا تو فرماتے کہ "یہ میرے گھر کی زبان ہے حضرات لکھنؤ یوں نہیں بولتے"۔

تعلیم و تربیت

والد بزرگوار کو دفتر ادب سے تعلق تھا اور ماں بھی اتنی فارسی جانتی تھیں کہ جامع عباسی پڑھ لیتی اور پڑھا دیتی تھیں۔ ان کی وضع ان کا لباس، ان کی رفتار گفتار شرافت کا نمونہ سمجھی جاتی تھی۔ بہو بیگم کے توسل سے جو اخوان ریاست ہنوز فیض آباد میں مقیم تھے وہ اس غیور خاندان سیادت کی عزت اپنے لئے باعث آرزش سمجھتے تھے۔ نکتہ رس بیگمات اور بذلہ سنج خواتین کے گھر میں آمد و رفت تھی انھیں کے آغوش ادب میں میر صاحب نے پرورش پائی۔

جب سن شریف چار سال سے متجاوز ہوا شفیق باپ نے مکتب میں بٹھایا اور درسیات کی عربی کتابیں میر نجف علی سے پڑھیں جو اسوقت فیض آباد میں فاضل مستند تھے۔

عربی کی تکمیل لکھنؤ میں علامۂ عصر مولوی حیدر علی سے کی۔ یہ صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے کس عمر میں تحصیل سے فراغت حاصل کی اور عربی کی تکمیل لکھنؤ آکر اسی زمانہ میں کی جب یہ خاندان فیض آباد میں تھا، یا درجۂ فضیلت اس وقت حاصل ہوا جب مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت اختیار کی چونکہ میر خلیق تقریباً ہر سال لکھنؤ آتے تھے اور غازی الدین حیدر کے وقت میں ان کی کافی شہرت دارالسلطنت میں ہو چکی تھی لہذا گمان غالب ہے کہ عالم شباب ہی میں کچھ عرصہ تک لکھنؤ رہ کر میر صاحب نے رائج الوقت علوم کی تکمیل کی ہو۔

اہل لکھنؤ نے میر انیس کو طبقۂ علما میں کبھی شمار نہیں کیا لیکن اُن کا علمی

تبحرّ اور وسعتِ نظر سب کو تسلیم تھی کہتے ہیں کہ ایک روز کوئی صاحب صدرا کی ایک عبارت پر بحث کر رہے تھے۔ میر صاحب نے اپنے حسنِ بیان سے اُس مسئلہ کو بغیر کتاب دیکھے اس خوبی سے حل کر دیا کہ سب دنگ[1] ہو گئے۔

یہ بھی مشہور ہے کہ میر صاحب کو بہ نسبت منقولات کے معقولات سے زیادہ دل چسپی تھی۔ اور ان کے مختصر کتب خانہ میں ہر علم و فن کی ضروری کتابیں جمع رہتی تھیں۔ میر صاحب کا مشہور مطلع ہے :۔

ع جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے

ایک صاحب نے غائبانہ اعتراض کیا کہ "مسافت شب ماہتاب طے کرتا ہے نہ کہ آفتاب" بات مشہور ہو گئی اور میر صاحب کے کان تک پہنچی۔ آپ نے برسرِ مجلس علم ہیئت کے استدلال سے فاصلۂ شب میں دورۂ شمسی کو ثابت کیا اور نکتہ چینوں کو ساکت کر دیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ گھوڑے کی تعریف میں ارشاد ہوا کہ :۔

پامال نہ ہوں پھول جو گلزار[2] پہ دوڑے ۔۔۔ سم تر نہ ہوں گر قلزمِ زخار پہ دوڑے
اس طرح رگِ ابرِ گہربار پہ دوڑے ۔۔۔ جس طرح سے بجلی کی صدا تار پہ دوڑے

کسی نے اعتراض کیا کہ "بجلی کی آواز تار پر نہیں دوڑتی ہے بلکہ حرکت دوڑتی ہے"۔

---

[1] حیاتِ انیس صفحہ ۲۰

[2] بعض سفیہوں نے اعتراض کیا کہ اس بند کی ردیف سے پہلو ذم کا نکلتا ہے اس کے جواب میں مرزا اوج کے اس مصرعہ پر ع میں پہلوان چین ہوں مرا توشہ چیں ہے یہ۔

اور نیز اس مصرعہ پر ع پامال کر دلاشوں کو ٹاپوں سے کچل کے۔

انیسیوں کی طرف سے نکتہ چینی کی گئی کہ احمد کہا گیا کہ مرزا دبیر کے اس مصرعہ میں ع پھڑ پھڑاہٹ اُڑ انگوٹھا یہ سطر دکھلا دو نہایت مذموم پہلو ہے لیکن یہ سب جاہلوں کی باتیں ہیں۔ مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند۔

آپ نے علم طبعیات سے ثابت کیا کہ مادی اشیا میں جب تصادم ہوگا آواز یقینی پیدا ہوگی" اور "وہ فاصلہ جو مادۂ برقی کے خلا میں واقع ہے آواز سے مملو ہے خواہ وہ آواز مسموع ہو یا نہ ہو"

فنونِ سپہگری

اس وقت تک ہندوستان میں شجاعت و مردانگی کی بو باقی تھی۔ شریف زادے شہسواری۔ سیف زنی اور نیزہ بازی کی مشق کیا کرتے تھے۔ انھوں نے بھی امرازادگان فیض آباد کے ساتھ اس ضروری فن کی مشق کی اور پھر لکھنؤ آکر اپنے پڑوسی میر کاظم علی سفید پوش کے بیٹے میر امیر علی سے جو پٹے، بانک، بنوٹ کے اُستاد تھے "علی مد، لکڑی کا ٹھاٹھ اور بانک بنوٹ کی گھائیاں سیکھیں۔ اور ایسی صفائی اور چابکدستی حاصل کی کہ کبھی کبھی اُستاد پر چوٹ کر جاتے تھے۔ یہ تعلیم بھی غالباً اسی زمانہ میں پائی جب وہ تکمیل عربی کے لئے لکھنؤ میں قیام پذیر تھے اور عنفوان شباب تھا۔ ان کے اُستاد میر امیر علی کہا کرتے تھے کہ میر انیس کو اُس عمر اور اُس حالت میں بھی اپنے رکھ رکھاؤ کا اتنا خیال تھا کہ کبھی ننگے بدن مشق فن نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے مناسب کپڑے تیار کرائے تھے اور بالاخانہ کی چھت پر مشق کرتے تھے جہاں میرے اور اُن کے سوا دوسرا نہ ہوتا تھا، یہ بھی قول تھا کہ "اگر میر انیس کے ہاتھ میں ایک گز لٹھے کے رومال میں ۱۰۰ روپیہ سا ہی پیسہ بندھا ہوتا تو وہ دس لکڑی پھینکنے والوں سے بھی چوٹ نہ کھا سکتے تھے۔ انکی ضرب کو بنوٹ جاننے والے کے سوا کوئی روک نہ سکتا تھا"۱؎ یہ تعلیم آگے چل کر ہمیں سخن کے بہت کام آئی۔ میدان جنگ کی تصویر کشی میں مبارزوں کی فنون حرب، ایک دوسرے کے داؤں پیچ، نیزہ بازی کی گھاتیں جو آج ان کی شاعری کا

۱؎ حیات انیس صفحہ ۲۲ و ۲۳

وہ امتیاز ہیں اسی مشق کے سلسلہ میں حاصل ہوئیں۔ اسی زمانہ میں ورزش بھی شروع کی تھی پچاس ساٹھ ڈنڑ فرش پر کرتے اور سو دو سو ہاتھ مگدر کے ہلاتے تھے۔ پیرانہ سالی میں ورزش گھٹ گئی۔ تاہم چند ڈنڑ کرنا اور پچاس ساٹھ ہاتھ کے مگدر ہلانا موقوف نہیں ہوا۔

شکل و صورت میر انیس کا رنگ سانولا اور قد مائل بہ درازی تھا۔ سر کے بال باریک ملائم۔ چہرہ خوبصورت کتابی۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ داڑھی باریک کترواتے تھے ایسی کہ لوگوں کو منڈاتے کا شبہہ ہوتا۔ گردن صراحی دار سینہ چوڑا چال نہایت مستعلیق۔ آخر میں ضعف پیری نے قویٰ مضمحل کر دیے تھے۔ مگر جب منبر پر پہونچتے تو دور سے ایک خوبصورت نوجوان معلوم ہوتے اور خداداد قوت پیدا ہو جاتی تھی سر پر لکھنؤ کی بیضادی پنج گوشہ ٹوپی۔ بدن پر گھیردار لانبا کرتا غرارے دار ڈھیلا پائجامہ۔ پاؤں میں زرد مخمل کی جوتی۔ ہاتھ میں پتلی چھڑی اور سفید رومال۔ نوعمری سے پیری تک اسی وضع پر قائم رہے اور لکھنؤ کی آب و ہوا سے جو روز جدید فیشن تراشا کرتی تھی بالکل متاثر نہیں ہوئے۔

شاعری کا آغاز شاعروں کے گھر میں جنم لیا بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف طبیعت مائل تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی ابیات عاشقانہ گنگناتے اور ان سے لطف اٹھانے لگے ہزاروں شعر اردو و فارسی کے یاد تھے اور ایک ایک لفظ کی سند میں بیسیوں شعر پڑھ دیا کرتے تھے۔ جمادات، نباتات۔ حیوانات میں محاسن قدرت کا نظارہ بڑی دلچسپی سے کرتے تھے اور اسی لطف اندوزی نے چند سال کے بعد مناظر قدرت کی تصویر اتارنے میں مانی و بہزاد پر فائق کر دیا۔

نواب سید محمد خاں رند[1] جو عمر میں ان سے چار سال بڑے تھے کمسنی سے

---

[1] ملاحظہ ہو تذکرۂ رند مطبوعہ انوار المطابع لکھنؤ قیمت ۸/

شعر کہتے اور میر خلیق سے اصلاح لیتے تھے، ان کی عشق انگیز صحبت نے حسن پرستی کی آتش پر ایسا تیل چھڑکا کہ پندرہ سولہ برس کے سن میں دل کا جوش اشعار کی صورت میں ظاہر ہونے لگا سلسلۂ تعلیم جاری تھا۔ مشق سخن باپ سے چھپاتے تھے مگر یہ آگ کب دبتی ہے؟ ایک موقع پر کہیں مشاعرہ میں گئے اور غزل پڑھی۔ وہاں بڑی تعریف ہوئی۔ شفیق باپ خبر سُن کر باغ باغ ہوا ہونہار فرزند سے پوچھا کل رات کو کہاں گئے تھے۔ انھوں نے حال بیان کیا۔ غزل سنی اور فرمایا کہ اب اس غزل کو سلام کرو اور اس شغل میں زور طبع صرف کرو جو دین و دُنیا کا سرمایہ ہے۔ سعادت مند بیٹے نے اس نصیحت پر عمل کیا دُنیا کو چھوڑ دین کے دائرہ میں آگیا اور تمام عمر اسی رنگ میں صرف کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں جو غزلیں تصنیف کی تھیں ان کا مجموعہ خاندان میں محفوظ ہے لیکن چشم اغیار سے مخفی رکھا جاتا ہے اشعار ذیل اسی عہد کے کلام کا نمونہ ہیں۔

ہوا ہے ابر ہے ساقی ہے مے ہے مگر تو ہی نہیں افسوس ہے ہے
لکھ کر زمیں پہ نام ہمارا مٹا دیا انکا تو کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

تجویز تخلص | جب عربی کی تکمیل کے لئے لکھنؤ میں قیام ہوا مشق سخن جاری تھی، سلام کہتے اور والد ماجد سے اصلاح لیتے۔ بیان مصائب کے لئے تخلص "حزیں" مناسب تھا لہذا یہی تخلص اختیار کر رکھا تھا۔ اس وقت لکھنؤ میں ناسخ و آتش کی محفلیں گرم تھیں یہ دونوں بزرگ میر خلیق کی زباں دانی اور سخنوری کا لوہا مانے ہوئے تھے۔ شیخ ناسخ اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ "بھئی زبان سیکھنی ہے تو میر خلیق کے یہاں جایا کرو" میر خلیق گاہ گاہ

---

۵۱ آبِ حیات۔ دور پنجم تذکرہ انیس جو بقیمت ۲ر انوار المطابع لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

شیخ ناسخ سے ملنے جاتے تھے۔ ایک روز اپنے اقبال مند صاحبزادے کو بھی ساتھ لے گئے۔ صحبت شعر و شاعری گرم تھی۔ شیخ صاحب نے میر انیس سے مخاطب ہو کر فرمایا "میاں صاحبزادے کچھ اپنا کلام پڑھو" میر صاحب نے والد کی اجازت سے یہ مطلع پڑھا:-

کھلا باعث یہ اس بے درد کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

شیخ صاحب جھومنے لگے۔ میر خلیق سے فرمایا۔ فرزند ہونہار ہے لیکن۔ بجائے حزیں کے تخلص کچھ اور ہو تو بہتر ہے۔ میر خلیق نے کہا آپ ہی کوئی تخلص تجویز فرمائیں۔ شیخ صاحب نے تھوڑی دیر سکوت کر کے فرمایا کہ مجھ کو تو انیس پیارا معلوم ہوتا ہے۔" حزیں نے بکمال ادب سلام کیا اور اسی وقت سے انیس[1] ہو گئے

---

[1] تخلص کے متعلق حیات دبیر میں ایک لطیفہ درج ہے جو ناظرین کی تفریح طبع کے لئے یہاں نقل کیا جاتا ہے "مفتی میر عباس کے روبرو ایک انیسیے اور ایک دبیریے جھگڑ رہے تھے ہر شخص اپنے ممدوح کے کلام کو پڑھ کر اسکی خوبیاں بیان کر کے دوسرے پر ترجیح دے رہا تھا رفتہ رفتہ دبیریے بولے "اور باتیں تو درکنار ایک تخلص ہی کو دیکھئے کس قدر عظمت اور برکت نمایاں ہے اسکے وزن پر کس کثرت سے تخلص ہیں مشیر، منیر، مطیر، نظیر، قدیر، ظہیر، فقیر، امیر، وزیر، نصیر، صغیر، سفیر، حقیر، کبیر وغیرہ۔ وہاں کیا ہے ڈھاک کے تین پات انیس، نفیس، سلیس، آگے بڑھئے تو جلیس"۔ مفتی صاحب نے فرمایا تخلص تو ادھر بھی بہت ہو سکتے ہیں پوچھا کیا، فرمایا انیس ۱۹، بیس ۲۰، اکیس ۲۱، بائیس ۲۲، تئیس ۲۳، چوبیس ۲۴، اڑتالیس ۴۸ تک حاضرین یہ لطیفہ سنکر بے اختیار ہنس پڑے اور فضول جھگڑے کا خاتمہ ہو گیا۔" مؤلف صاحب انیس کے صاحبزادے رئیس کو بھول گئے اس کو بھی جانے دیجئے دُرِّ یتیم صدف میں اکیلا ہی ہوتا ہے "حسین" سے زیادہ کس کے نام میں عظمت و برکت ہو سکتی ہے ارشاد فرمائیے کہ "حسین" کے ہم وزن اور ہم قافیہ کتنے نام ہیں؟

اصلاح غلط فہمی میر مہدی حسن مؤلف واقعاتِ انیس نے تحریر فرمایا ہے کہ "لکھنؤ کے اکثر کہن سال بزرگوں سے دریافت ہوا کہ زمانۂ امجد علی شاہ میں میر انیس کا مستقل قیام لکھنؤ میں ہوا" اور اس بنا پر بعض محققین کو شبہہ ہوا کہ عہد امجد علی شاہ سے پیشتر میر صاحب لکھنؤ تشریف نہیں لائے اور ان کی شاعری کا آغاز اسی تاجدار کے عہد سے ہے۔ اس خیال کی تکذیب متذکرۂ بالا واقعہ سے بخوبی ہوتی ہے۔ شیخ ناسخ نے ۱۲۵۴ھ میں وفات پائی اور امجد علی شاہ ۱۲۵۸ھ میں تخت نشین ہوئے۔ عہد امجد علی شاہ میں ناسخ زندہ ہی نہ تھے تخلص کیونکر تجویز کرتے۔ علاوہ اس کے امجد علی شاہ کے آغاز سلطنت کے وقت میر صاحب کی عمر ۴۲ برس کی تھی اگر اس سن و سال میں وہ پہلی بار لکھنؤ تشریف لائے ہوتے تو میاں امیر علی جنھوں نے میر صاحب کو فنون سپہ گری کی تعلیم دی تھی یہ کیونکر کہتے کہ "نو عمری میں بھی میر انیس کو خودداری کا لحاظ تھا" بیشک عہد امجد علی شاہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس متشرع سلطان کے زمانہ میں اس خاندان کی سیادت نے فیض آباد سے قطع تعلق کر کے مستقلاً سکونت لکھنؤ کی اختیار کی لیکن لکھنؤ کی آمد و رفت عرصہ سے جاری تھی۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں بھی میر انیس مرثیہ کہتے تھے اگرچہ مجلسوں میں پڑھتے نہ تھے اور اس وجہ سے شہر میں کافی شہرت نہ تھی۔

ابتدائی مرثیے میر انیس کے ابتدائی مرثیے مختصر ہوتے تھے اور ان کا مقصود محبان حسین کو رلانا تھا اس زمانہ کے مرثیہ بیشتر "اے مومنو" سے شروع ہوتے تھے اور ان میں رزم کا بیان بہت کم ہوتا تھا۔

۱۲۴۹ھ سے سرآمد مرثیہ گویان لکھنؤ میر مظفر حسین ضمیر نے مرثیہ گوئی کا جدید دور شروع کیا اور مرزا سلامت علی دبیر نے رزم و سراپا میں زیادہ

بلند پروازی کی کہ قدیم روش نظروں سے گر گئی اور سخن فہم طرز جدید کے مرثیے تلاش کرنے لگے۔

میر خلیق۔ ضمیر اور دبیر کی تقلید اپنے لیے باعث تحقیر سمجھ کر میدان رزم میں مقابل نہیں آئے مگر بلند اقبال فرزند جس کو قسام ازل نے اسی صنعت سخن کی تکمیل کے لیے خلق فرمایا تھا یہ عجز کیونکر گوارا کر سکتا تھا۔ اس نے ابھی تک لکھنؤ میں مجلسیں نہیں پڑھی تھیں لیکن خزانۂ کلام فراہم کر رہا تھا اور وہ وقت قریب تھا کہ سارے شہر کو اپنی خوشنوائی کا اسیر بنا لے۔

اس نے جو عزیمت کی وہ اسی کی زبان سے سننا چاہیے۔

شوقِ مداحیِ شبیرؑ عطا کر یا رب
مبتدی ہوں مجھے توقیر عطا کر یا رب

نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یا رب
سلک گوہر ہو وہ تقریر عطا کر یا رب

جدّ و آبا کے سوا اور کوئی تقلید نہ ہو
لفظ مغلق نہ ہو گنجلک نہ ہو تعقید نہ ہو

شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
قلم فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ

خون برستا نظر آئے جو دکھاؤں صف جنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ

رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہووے
روزمرہ شرفا کا ہو سلاست ہووے

(حاشیہ صفحہ ۷۷) لہ مرزا دبیر ۱۱ رجمادی الاولیٰ ۱۲۱۸ھ کو بمقام دہلی محلہ بلی ماراں میں پیدا ہوئے چودہ پندرہ برس کی عمر سے شاعری شروع کی اور ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ کو لکھنؤ میں وفات پائی۔ محلہ نخاس جدید اپنے مکان میں مدفون ہوئے اب یہ گلی کوچہ دبیر کہلاتی ہے ۱۲ تاریخ وفات حضرت فرشش نے اس مصرعہ سے نکالی۔ دبیر از جہان رجہان رفتہ ہائے ہائے۔ مولانا آسی فرماتے ہیں۔ سلخ محرم آمدہ روز وصال او ۱۲

ھ ۱۲ ۵۲

سامعین جلد سمجھ لیں جیسے صنعت ہووے یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہووے
لفظ بھی چُست ہوں مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

بزم کا رنگ جدا رزم کا میداں ہے جدا یہ چمن اور ہی زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامہ کا عنواں ہے جدا مختصر پڑھ کے رُلا دینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

پہلی مجلس | جب لعل و گہر کا خزینہ کافی جمع ہو گیا۔ کئی رباعیاں متعدد سلام اور طرز جدید کے چند مرثیے مرتب ہو گئے۔ شفیق باپ نے ہونہار صاحبزادے سے تحت لفظ پڑھنے کی بھی مشق کرا لی تو مناسب خیال کیا کہ ان سے مجلس میں مرثیہ خوانی کرائی جاوے تاکہ میر خلیق کا پلہ جو ضمیر اور دبیر کی بلند پردازی سے کم وزن ہوتا جاتا تھا نقطۂ اعتدال پر آ جائے۔

ایک روز اکرام اللہ خاں کے امام باڑے محلہ نخاس میں مجلس تھی۔ میر ضمیر بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجلس شروع ہونے سے پہلے میر خلیق نے میر ضمیر سے کہا میں چاہتا ہوں آج آپ کے بھتیجے سے بھی کچھ پڑھواؤں۔ میر ضمیر نے فرمایا بسم اللہ میر انیس اپنے والد کے حکم سے منبر پر گئے۔ میر خلیق منبر کے دوسرے زینے پر بیٹھے تھے یہ اس سے ایک درجہ بلند تیسرے زینے پر بیٹھے اور اس وقار سے بیٹھے کہ تمام حاضرین مجلس کی نگاہوں میں خوبصورت ٹھاٹھ جم گیا۔ پہلے کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر ایک رُباعی پڑھی۔ چاروں طرف سے واہ واہ سبحان اللہ کا شور بلند ہو گیا۔

بالیدہ ہوں، و اوج مجھے آج ملا ظلّ عَلَم صاحب معراج ملا
منبر پہ نشست سر پہ حضرت کا علم اب چاہیے کیا تخت ملا تاج ملا

میر انیس نے پہلے ایک سلام پڑھ کے ساری مجلس کو گرویدہ کر لیا پھر مرثیہ شروع کیا تو رزم بزم کی بولتی چالتی تصویریں اس خوبی اور خوش ادائی سے دکھائیں کہ ہر دل بسمل ہو گیا۔ اعجاز کلام اور انداز بیان نے مجلس کو بیتاب کر دیا سخن شناس جوش شجاعت کے بند سن کر جھومنے لگے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

جب مرثیہ ختم ہوا سیکڑوں قدر شناس اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر میر انیس سے مصافحہ کرنے ہاتھ چومنے سامنے آئے تعریف کا سلسلہ دیر تک قائم رہا اور اسی مجلس نے ہمیشہ کیلئے انیس کی فصاحت و شیریں کلامی کا سکہ شہر میں بٹھا دیا۔

لکھنؤ میں مستقل قیام جب میر انیس کی شہرت روز بروز بڑھنے لگی بڑے بڑے نواب و امراء اُن کے زیب مجلس ہونے پر فخر کرنے لگے تو امجد علی شاہ کے عہد میں انھوں نے فیض آباد سے قطع تعلق کر کے لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ اس وقت میر صاحب کی عمر ۴۲ برس سے زیادہ تھی۔ بڑے صاحبزادے میر خورشید علی نفیس اور دو صاحبزادیاں پیدا ہو چکی تھیں، لکھنؤ میں میر صاحب کا قدیم مکان محلہ سبزی منڈی یا شیدیو کے احاطہ میں تھا۔ یہ محلہ آصف الدولہ کے امام باڑہ کے قریب واقع تھا۔ اور اس میں شرفا اور امرائے شہر کے مکانات تھے۔ سلطنت اودھ کا تختہ الٹ جانے کے بعد مکانات کھدنا شروع ہوئے تو اس محلّہ کا نشان بھی باقی نہ رہا۔ یہ مکان مختصر تھا اور میر صاحب کی عظمت و شان سے بہت پست مگر تاجدار ان سخن ملک قناعت کا بادشاہ حرص و ہوس سے متنفر تھا۔ فرماتے ہیں ؎

کریم جو تجھے دینا ہو بے طلب دیدے فقیر ہوں یہ نہیں عادت سوال مجھے

میر صاحب کے معتقد خاص نواب دیانت الدولہ بہادر نے اسی محلہ میں ایک امام باڑہ اور ایک محلسرا تیار کرائی۔ عاشور خانہ میں پہلی مجلس میر صاحب نے

پڑھوائی اور محل نذر کیا۔ غدر کے پر آشوب ہنگامہ تک یہ خاندان اسی محل میں سکونت پذیر رہا۔

انداز مرثیہ خوانی میر صاحب جس طرح مرثیہ گوئی میں کامل تھے ویسے ہی اُنکا انداز مرثیہ خوانی بھی بے نظیر تھا۔ کلام پر تبصرہ آیندہ اوراق میں کیا جائیگا مگر اُنکے طرز مرثیہ خوانی کی بابت اسی مقام پر چند سطریں لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد آب حیات میں تحریر فرماتے ہیں "میر انیس مرحوم کو میں نے پڑھتے ہوئے دیکھا کہیں اتفاقاً ہی ہاتھ اُٹھ جاتا یا گردن کی ایک جنبش یا آنکھ کی گردش تھی کہ کام کر جاتی ورنہ کلام سارے مطالب کے حق پورے ادا کر دیتا تھا۔"

جناب اشہری حیات انیس میں لکھتے ہیں کہ "میں نے میر انیس کو پڑھتے ہوئے سُنا ہے وہ فقط ابرو کے اشارہ اور گردن کی حرکت سے کام لیتے تھے۔" لیکن مؤلف واقعات انیس ان واقعات سے ناراض ہوتے اور فرماتے ہیں کہ "میر انیس کا پڑھنا ہنگامہ آرا تھا وہ جس مقام کو پڑھتے تمام قوتوں سے کام لیتے چنانچہ اُن کا ایک مصرعہ سات سال کی عمر میں سُنا ہوا میرے حافظہ میں اس وقت تک محفوظ ہے اور اس کے موشنس کی تصویر اب تک پیش نظر ہے۔ ع :۔ دانتوں میں شجاعان عرب واڑھیاں دابے۔ مرثیہ کو زانو پر رکھ کر دونوں ہاتھوں کو داڑھی کے قریب لا کر اس طرح گردش دی اور ہونٹوں میں فرضی داڑھی کو دبایا یہ معلوم ہوا کہ عرب کے شجاع سپاہیوں کی حالت جنگ میں جوش شجاعت کی تصویر کھینچ دی۔"

ہفت سالہ بچہ کی شہادت معتبر نہیں! خصوصاً جبکہ سن رسیدہ اور ثقہ راوی اس کی تکذیب کرتے ہوں!! میر خورشید علی نفیس کے پڑھنے کا دہی

انداز تھا جو احسن نے لکھا ہے۔ لیکن محققین کہتے ہیں کہ میر انیس صرف گردش چشم و ابرو سے وہ ہنگامہ برپا کر دیتے تھے جس کے لئے ان کے صاحبزادہ کو تمام اعضائے جسمانی سے کام لینا پڑا۔ شیخ حسن رضا مؤلف "تردید موازنہ" لکھتے ہیں کہ افراط و تفریط کا نام نہیں نشست سے بالائے منبر قدرت خدا کے جلوہ کی تصویر کھینچ دیتے۔ ہونٹ و تصنّع کی ہوا تک نہ آنے پاتی تھی تیور اور اشارات مہذبانہ جیسے ان بزرگ سے ادا ہوئے آج تک کسی غیر سے تو کیا اُن کے خاندان میں کسی سے حتیٰ کہ اُن کی اولاد سے بھی وہ شان اور وہ بات دیکھنے میں نہیں آئی۔" یہ بھی مشہور رہا ہے کہ میر انیس جب کوئی مقام رقت انگیز پڑھتے اور جوش گریہ سے بے چین ہو جاتے تو ضبط کی غرض سے نیچے کے ہونٹ کو دانتوں میں دبا لیتے جس سے وہی جانب کا رخسارہ متحرک ہوتا تھا ان کا تو اس انداز سے یہی مقصود تھا کہ جوش گریہ سے آواز گلوگیر نہ ہو مگر قدرتاً یہ دلفریب ادا ہر دل کو بیتاب کر دیتی تھی۔

مؤلف حیاتِ رشید لکھتے ہیں کہ میر انیس کے نواسے جناب پیارے صاحب رشید اکثر فرماتے تھے کہ "انیس کا پڑھنا بہت مہذب تھا۔ وہ صرف آواز کے اُتار چڑھاؤ اور اشارات سے کام لیتے۔ آجکل کے پڑھنے والے تو منبر کی چولیں ہلا دیتے ہیں۔"

کہتے ہیں جب کوئی شخص میر انیس سے انداز مرثیہ خوانی سیکھنے کی درخواست کرتا وہ اس سوال سے منغض ہو جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ "تم کیا سیکھو گے اور میں کیا سکھاؤں گا۔ بھائی یہ کچھ سیکھنے کا فن ہے وقت پر جو کچھ ہو جاتا ہے ہم خود نہیں سمجھتے کہ ہم نے کیا کیا۔"

شہر کے ایک رئیس زادے میر صاحب کے شاگرد مرثیہ پڑھنے کی مشق

کرتے تھے۔ ایک روز میر انیس نے ایک مصرع کو تین بار بتلایا مگر نواب زادہ سے وہ انداز ادا نہ ہو سکا۔ میر صاحب نے مرثیہ ہاتھ سے چھین لیا اور فرمایا ایسے بے مغزوں کو مرثیہ پڑھنا نہیں آسکتا۔ بیکار اپنا وقت خراب کرتے ہیں اور میرا دماغ پریشان ہوتا ہے مصرع یہ تھا ع

کھینچے جو کماں دوے نہ اماں پیل دماں کو

وہ اصول خواندگی کے ساتھ صنعت شاعری کے اظہار کے لئے اُن تینوں لفظوں پر زور دیتے جن پر نشان دیا گیا ہے لیکن نواب کو بسبب عدم مذاق شاعری مصرعہ کی صنعت کا لحاظ نہیں رہتا تھا۔ میر صاحب اس مصرعہ کو پڑھتے تو کماں اماں دماں پر زور دینے کے بعد ایک قلیل وقفہ دیتے تھے اور یہی توقف اس مصرعہ کی جان تھا!!!

مرزا دبیر کا انداز مرثیہ خوانی | ان کے حریف مقابل مرزا سلامت علی دبیر کی مرثیہ خوانی کا بھی یہی انداز تھا۔ تقاضائے فطرت سے کہیں خود بخود ہاتھ اٹھ جاتا تو اٹھ جاتا ورنہ منبر پر بیٹھ کر "ہوشنس" دکھانا گناہ سمجھتے تھے چشم وابرو کا اشارہ بھی اسی قدر ہو جاتا جتنا باتوں میں ہو جاتا ہے۔ خود فرماتے ہیں :-

ناحق نہ چیخنا نہ چلّانا ہے | بیکار نہ ہر بند پہ بتلانا ہے
ابن شہِ مرداں کا ثنا خواں ہوں میں | صد شکر کہ پڑھنا مرا مردانا ہے

جب میر انیس نے مجالس میں مرثیہ خوانی شروع کی اُس وقت دبیر کے انداز پر لکھنؤ فدا تھا میر صاحب خود فرماتے تھے کہ "جب ہم نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا اُسوقت دو صاحب اس فن کے لکھنؤ میں نامی وگرامی تھے۔ ایک میر مداری صاحب

۱؎ واقعات انیس صفحہ ۲۷ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ میر صاحب نے اس موقع پر صرف مرثیہ خوانی کی طرف اشارہ کیا ہے نہ کہ "مرثیہ گوئی" کی طرف کیونکہ اس وقت میر ضمیر اور میر خلیق دونوں

جو پاریں رہتے تھے دوسرے مرزا سلامت علی دبیرؔ"
میر بداری کا تو اب کوئی نام بھی نہیں جانتا غالباً ان کا تخلص شہرت تھا وہ میر ضمیرؔ کے شاگرد تھے اور اس فن میں خوب مشق بہم پہونچائی تھی۔ آج زمانہ نے گمنام کر دیا اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مرثیہ خوانی میں "نیرت" سے کام لیتے تھے یا نہیں مگر مرزا دبیر یقیناً اس حرکت کو ناجائز سمجھتے تھے۔
جب میر صاحب کا انداز مرثیہ خوانی مقبول ہوا شفیق باپ نے مجلسوں میں پڑھنا چھوڑ دیا۔ ادھر میر ضمیرؔ نے بھی ضعف پیری سے مرثیہ خوانی چھوڑ دی اور لکھنؤ میں انیسؔ و دبیرؔ کا نام گونجنے لگا۔

میر خلیق نے مرثیہ خوانی چھوڑی | میر خلیق نے مرثیہ خوانی چھوڑی لیکن قدرتی شاعر کی زبان کیونکر بند ہو سکتی تھی۔ ایک مرتبہ میر انیسؔ یہ روایت نظم کر رہے تھے کہ جناب امام حسین عالم طفولیت میں سواری کے لئے ضد کرتے ہیں۔ آنحضرتؐ تشریف لائے اور فرط شفقت سے خود جھک گئے کہ آؤ سوار ہو جاؤ تا کہ پیارے نواسے کا دل آزردہ نہ ہو۔ اس موقع پر ٹیپ کا دوسرا مصرعہ کہہ لیا تھا ع۔ اچھا سوار ہو جیے ہم اونٹ بنتے ہیں۔ پہلا مصرع برجستہ نہ ہوتا تھا۔ ان کو غور میں دیکھ کر خلیق نے پوچھا کیا سوچ رہے ہو۔ میر صاحب نے مضمون بیان کیا تو بولے کہ یہ مصرعہ لگا دو۔ جب آپ روٹھتے ہیں تو مشکل سے مناتے ہیں۔ سارا بند سنئے تو مصرع کا لطف معلوم ہو۔

پیدل تو عید گاہ میں جانا ہی ننگ تھا ۔۔۔ ہمکو بھی آج اونٹ منگا دو تو ہوں سوار
کہنے لگے حسینؑ سے محبوب کردگار ۔۔۔ معلوم اب ہوا ابھی غصہ تھا ہیں نثار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳) اساتذہ فن موجود اور سرتاج مرثیہ گویاں تھے۔ ان کے سامنے مرزا دبیر یا میر بداری کی ہرگز شہرت نہیں ہو سکتی تھی۔

جب آپ بوڑھے ہیں تو مشکل سے بنتے ہیں
اچھا سوار ہو جیسے ہم اونٹ بنتے ہیں

افسوس ہے اُن کا کلام آج تک شائع نہیں ہوا اور متعدد مرثیے جو میر نواب صاحب نامی نے ۱۲۹۷ھ میں دکن سے شائع کئے اُن میں بیشتر وہ ہیں جو میر انیس کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے مرثیوں کا مجموعہ لکھنؤ میں بعض علم دوست حضرات کے پاس موجود ہے مگر معلوم نہیں کس مصلحت سے اسکی اشاعت نہیں کراتے۔

مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ ذیل کا مطلع و مقطع میر خلیق کے سنِ اخیر کی تصنیف ہے۔

مجرائی طبع کند ہے لطفِ بیاں گیا
دنداں گئے کہ جوہرِ تیغِ زباں گیا
گذری بہارِ عمرِ خلیق اب کہیں گے سب
باغِ جہاں سے بلبلِ ہندوستاں گیا

سعادت مند فرزند نے باپ کا نام روشن کیا اور ان کی زبان پر ہمیشہ ناز کرتا رہا

حق ہے سنا نہیں کبھی اس حسن کا بیان — گویا کہ یہ خلیق کی ہے سر بسر زباں

اور اُن کے انتقال کے بعد نہایت درد سے کہا:۔

ہم مر گئے خلیق کے مرنے سے اے انیس — جینے کا لطف اٹھ گیا اس باخدا کے ساتھ
افسوس ہے خلیق سا مشفق پدر نہیں — اس رنج سے کبھی کو کسی کی خبر نہیں

اُسی زمانہ میں ایک نہایت زور کا مرثیہ لکھا تھا جس کا مطلع ہے:۔

آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی

اُس کے مقطع میں فرماتے ہیں کہ:۔

بس اے انیس بس کہ دعا کا ہے یہ مقام ۔ ہو مغفرت خلیق کی یا خالق الانام
مدّاح آل پاک نبی تھا وہ خوش کلام ۔ یارب اُسی بزرگ کا یہ فیض ہے تمام

بندہ وہ کون سا ہے کہ جو بے قصور ہے
گر بخش دے تو کیا تری رحمت سے دُور ہے

انیس و دبیر | میر خلیق اور میر ضمیر نے مرثیہ خوانی چھوڑی انیس و دبیر کے لئے میدان خالی ہوگیا۔ شہر کے خوش مذاق لوگوں نے دونوں کو حریف مقابل بنایا۔ نقّادان سخن کے جتھے علیحدہ علیحدہ بٹے ہوئے تھے۔ انیسی امت اپنے سخن آفریں کی صفائی کلام حسن بیان اور لطف محاورہ پر جان دیتی۔ اور دبیری امت شوکت الفاظ بلند پردازی اور تازگی مضامین پرستی ہوئی تھی۔ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ ؛ معتقدین باہم لڑتے مگر میر انیس اور مرزا دبیر ایک دوسرے کو نہایت عزّت و وقعت کی نظر سے دیکھا کیے۔

نہ میر انیس اپنی صحبت میں دبیر کی بدگوئی سننے کے روا دار اور نہ مرزا دبیر اپنے حلقۂ احباب میں کسی کو انیس پر بے جا اعتراض کرنے دیتے کلام پر نکتہ چینی جوہر کمال پر صیقل تھی اور یہ دونوں اُستادوں کے یہاں ایک دوسرے پر ہوتی رہتی تھی اور کبھی کبھی سخن گسترانہ چوٹیں ہو جاتی[۱] تھیں

---

[۱] لطیفہ۔ ایک صاحب میر محب علی سلیس خیال کرتے تھے کہ وہ میر انیس کے مدمقابل ہیں۔ میر انیس نے ایک سلام کہا جس کا مقطع ہے:۔

نواسنجیوں نے تری اے انیس ۔ ہراک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

جب یہ سلام سلیس کو پہونچا وہ سمجھے کہ یہ چوٹ مجھ پر ہے۔ فوراً سلام کی تظمین کر کے میر صاحب کے پاس بھیجدی۔ مقطع پر یوں مصرع لگائے تھے:۔
نہ موکس کی باتیں تھیں ایسی نفیس ؛ نہ تھی ذوق کی نظم ایسی سلیس ؛ یہ سچ ہے بقول انیس اے سلیس

مگر دل صاف تھے اور ایک دوسرے سے کچھ بغض نہیں تھا۔ میر خورشید علی نفیس[۱] فرماتے تھے ان کے والد کے سامنے کوئی شخص صراحتہً یا کنایتہً مرزا دبیر کی تنقیص نہیں کر سکتا تھا اور یہی طرح مرزا دبیر کے یہاں کسی کی مجال نہ تھی کہ میر صاحب پر بے جا حملہ کرے۔ دونوں ایک دوسرے کی نسبت فرماتے تھے کہ "ایسا صاحب کمال شاید پھر پیدا نہ ہو۔"

سید آغا حسن ازل لکھنوی نے مرثیوں پر اصلاح دونوں بزرگوں سے لی اور کمال یہ کیا کہ ہر ایک سے اجازت لے کر دوسرے کو مرثیے دکھائے اور ان نیک نفس پاک طینت حضرات نے بخوشی اجازت دی۔

| ایک سلام پر انیسیوں اور دبیریوں میں جھگڑا |

میر صاحب نے ایک سلام کہا جس کا مطلع تھا:-

سدا ہے فکر ترقی مآل بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

اور اس میں ایک لا جواب شعر تھا:-

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے
چنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو

قافیہ دشوار تھا اور نہایت بے ساختگی سے نظم ہوا۔ تمام شہر میں دھوم مچ گئی۔ مشاہیر شعرا نے اس زمین میں سلام کہے۔ واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ شاعر تھے۔ انھوں نے بھی یہ قافیہ باندھا۔ فرماتے ہیں:-

جہاد نفس عبادت میں مجھ کو ہے منظور
وضو کے وقت الٹتا ہوں آستینوں کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۶) نوازنجیوں نے تری اے نفیس
ہر اک زاغ کو خوش بیان کر دیا

جب میر صاحب کو یہ خمسہ پہونچا ایک نظر دیکھ کر چپ ہو گئے۔ وہ کوہ علم و وقار ایسی باتوں کی کب پروا کرتا تھا (حیات دبیر)

[۱] حیات دبیر صفحہ ۲۴۔ فٹ نوٹ

مرزا دبیر کے صاحبزادہ مرزا اوج نے بھی اسی زمین میں سلام کہا اور آستینوں کے قافیہ پر بہت زور دیا۔ کہتے ہیں:۔

اُلٹ گیا درِ خیبر سے پہلے قلعۂ چرخ　　خدا کے ہاتھ نے اُلٹا جو آستینوں کو
یہ دستِ بُردِ خزاں کا بہار بیٹھ رہی　　کہ غنچے تھامے ہیں مٹھی میں آستینوں کو

حق یہ ہے کہ میر صاحب کے شعر کی ہوا بھی کسی کو نہ پہونچی اور یہ قافیہ انھیں کے حصہ کا ہو گیا۔ ستم یہ ہوا کہ میر انیس کے چھوٹے بھائی میر مونس نے ایک مجلس میں جس میں شاگردانِ دبیر کا مجمع تھا اپنا سلام اسی زمین میں پڑھا اور اس میں یہ طنزیہ شعر بھی تھا ؎

بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل　　اُٹھا چکے ہیں انیس ان زمینوں کو

اور شاید یہ شعر بھی تھا:۔

نیا مزہ ہے کہ مضموں تو دستیاب نہیں　　مقابلہ پہ چڑھاتے ہیں آستینوں کو

شہزادگانِ اودھ میں سے نواب ممتاز الدولہ مرزا دبیر کے شاگرد اس مجلس میں موجود تھے ان کو سخت ملال ہوا مجلس سے اُٹھ کر چلے گئے۔ پھر تو انیسیوں اور دبیریوں میں شور مچ گیا۔ مرزا صاحب کے مشہور شاگرد میاں مشیر نے خوب بے نقط سنائیں:۔

جلی کٹی مرے استاد سے کرے جو کوئی　　تو پھونک دوں مع خرمن میں خوشہ چینوں کو
ہزار بار سزا پا کے منہ پہ چڑھتے ہیں　　مشیر کیا کہوں ان احمق الذہنوں کو
لگا کے سرمۂ تربت بہشت دیکھ لیا　　خجل کیا مری آنکھوں نے دوربینوں کو

اساتذہ کی ہیں غزلیں سلام بھی اکثر
نیا سمجھتے ہیں پھر لوگ ان زمینوں کو

نظیر برادر دبیر نے ایک سلام کے مقطع میں کہا:۔

طعنہ زن ہوتے ہیں جو بیٹھ کے منبر پہ نظیر
کیا نہیں جانتے وہ اہل زباں اور بھی ہیں

قربان جایئے ان دونوں بزرگوں کی صفائی قلب کے کہ میر صاحب مونس پر اور مرزا دبیر صاحب مشیر پر بہت خفا ہوئے۔ میر مونس مرزا صاحب کی خدمت میں اور شیخ مشیر میر صاحب کے حضور میں آکر عذر خواہ ہوئے اور وہ گرد کدورت دور ہو گئی۔

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

میر انیس کے پڑھنے کی خاص خاص مجلسیں

جن مجلسوں میں میر صاحب یا مرزا صاحب پڑھتے دُور دور سے شائقین آتے تھے اتنا مجمع ہوتا کہ زانو بدلنا دشوار رہتا اور دیر سے آنیوالوں کو بمشکل جگہ ملتی۔ ملکہ کشور والدۂ واجد علی خاں کے یہاں مجلسوں میں ہمیشہ میر صاحب پڑھا کرتے تھے حسین علی خاں اثر (خلف مرزا حیدر بیگ نائب آصف الدولہ) کے یہاں اربعین میں روزانہ مجلس ہوتی تھی ایک دن میر صاحب اور دوسرے دن مرزا صاحب پڑھتے لیکن ایک ہی مجلس میں یکے بعد دیگرے کبھی نہیں پڑھتے۔ آٹھویں یا ساتویں محرم کو ایک مجلس میر صاحب۔ نواب تقی علی خاں کے یہاں پڑھتے تھے۔

ایک روز مجلس شروع ہونے سے پہلے نواب صاحب نے پیغام بھیجا کہ میں آج دردِ سر کی وجہ سے حاضری مجلس سے معذور ہوں۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ آج میرا بھی مزاج درست نہیں ہے مناسب ہے مجلس موقوف رکھی جائے۔ انشاء اللہ سال آئندہ دیکھا جائے گا۔ نواب صاحب گھبرا کر باہر نکل آئے۔ میر صاحب سے معافی مانگی اور بحالت مرض میں اختتام مجلس تک بیٹھے رہے۔

ہر مہینے کی تیئیسویں کو محمد خاں داروغہ فیل خانہ شاہی کے یہاں محلہ مفتی گنج میں میر صاحب پڑھا کرتے تھے اور اسی محلہ میں اسی تاریخ کو وزیر خاں داروغہ کے یہاں مرزا صاحب پڑھتے تھے صفر کی اٹھارھویں کو حیدر خاں نامی ایک رئیس کے یہاں میر صاحب پڑھتے تھے اور اسی دن کچھ فاصلہ پر احمد علی خاں[1] سوز خوان کے یہاں مرزا صاحب پڑھا کرتے پچیسویں رجب کو ایک مجلس (بعد زمانہ غدر) چوپٹیوں پر ہوا کرتی اور اس میں میر صاحب پڑھا کرتے تھے۔ اسی تاریخ میر باقر تاجر کے امامباڑہ میں مرزا صاحب پڑھا کرتے تھے۔ داروغہ شیخ محمد عباس کے یہاں کنکر کے کنویں پر

---

[1] اس مجلس میں مرزا دبیر ہمیشہ ایک رباعی اس ردیف و قافیہ میں ضرور پڑھا کرتے تھے۔ حقیر آیا ہے۔ دبیر آیا ہے۔ نظیر آیا ہے۔

ایک مرتبہ اس مجلس کے آنے والوں سے راستہ میں بعض آدمیوں نے کہا کہ "مرزا احمد علی خاں کی مجلس میں نہیں آرہے"، اس فقرہ میں آکر کچھ لوگ جو اس مجلس میں آرہے تھے حیدر خاں کی مجلس میں چلے گئے جو قریب ہی ہوتی تھی اور اس میں میر انیس پڑھتے تھے۔ مرزا صاحب کو خبر ہوگئی منبر پر تشریف لائے تو اوّل یہ رباعی پڑھی :-

کس بزم ثواب میں حقیر آیا ہے :: سننے کو بھی انبوہ کثیر آیا ہے :: کیوں راہ میں بہکاتے ہیں مشتاقوں کو یہ کون ہے جو نہیں دبیر آیا ہے :: عبرت کا مقام ہے۔ لکھنؤ کی شاہی لٹ گئی۔ اشراف گردی کا دور تھا احمد علی خاں کی بھی وہ حالت نہ رہی اور اٹھارھویں صفر کی مجلس حسب معمول ہوئی نہ وہ اگلا سا مجمع نہ وہ جوہر شناسوں کی بھیڑ۔ حاضرین عہد نوابی کا ہجوم یاد کرکے افسوس کر رہے تھے۔

مرزا صاحب نے منبر پر جاکر حسب ذیل رباعی فی البدیہ پڑھی :-

پھر چرخ پہ آسمان پیر آیا ہے — ہر کوچہ میں وقت دادگیر آیا ہے
اگلا سا وہ مجمع ہے نہ اگلے سے وہ لوگ — یاں آن کے حیرت میں دبیر آیا ہے

۱۸ صفر کو میر انیس اور اسی کے قریب خان بہادر شیخ الطاف حسین کے یہاں مرزا صاحب پڑھتے۔ ہر جگہ اہل کمال کا جمگھٹ اور شائقین کی کثرت ہوتی تھی۔ میر انیس اسکی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں:۔

امید کسے تھی بزم کے بھرنے کی | اللہ جزا دے اس کرم کرنے کی
ماشاءاللہ چشم بد دور انیس | مجلس میں جگہ نہیں ہے تل دھرنے کی

شاہی مجلس | دونوں بزرگ ایک مجلس میں کبھی جمع نہ ہوتے تھے لیکن لکھنؤ کے حضرات دونوں کو جمع کئے بغیر کب ماننے والے تھے۔ نواب مفتاح الدولہ بہادر نے حضرت جان عالم واجد علی شاہ کے سامنے دونوں صاحبوں کی تعریف کرکے ایسی تقریر کی کہ بادشاہ سلامت نے دونوں کو ایک مجلس میں جمع کرنے کا ارادہ کرلیا۔ مفتاح الدولہ حسب الحکم خود دونوں صاحبوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بادشاہی پیغام پہونچایا۔ حکم سلطانی سے انحراف کیونکر ہو سکتا تھا دونوں نے منظور کیا۔ معینہ وقت پر پہلے مرزا دبیر پہونچے اور باریاب ہوکر ایک جانب بیٹھ گئے۔ میر صاحب کچھ دیر کے بعد پہونچے۔ فرش پر پاؤں رکھتے ہی تمام ارباب مجلس تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے جب مجلس شروع ہوئی پہلے مرزا دبیر کو پڑھنے کا حکم دیا گیا انھوں نے ایک رباعی بادشاہ کی تعریف میں پڑھکر مرثیہ شروع کیا۔ واہ واہ سبحان اللہ کی آوازوں سے محل شاہی گونجنے لگا اور رنگ مجلس بھی حاصل ہوا۔ ان کے بعد میر انیس کو پڑھنے کی ہدایت ہوئی۔ میر صاحب کچھ لیکر نہیں گئے تھے۔ اپنے بھائی مونس سے پوچھا کچھ لائے ہو انھوں نے ایک سلام اور مرثیہ پیش کیا اس کو دیکھا اور فی البدیہہ ایک مطلع تصنیف کرکے منبر پر تشریف لے گئے۔ کچھ دیر تک اپنی عادت کے موافق چپ بیٹھے رہے۔ پھر ایک رباعی جناب امیرؑ کی مدح

میں پڑھی۔ چاروں طرف آفرین و مرحبا کا شور بلند ہوا۔ زاں بعد سلام شروع ہوا جس کا فی البدیہہ مطلع یہ تھا:-

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

اس مطلع کا سننا تھا کہ معنی فہم طبیعتیں ادائے کلام کے مزے لینے لگیں۔ سلام ختم کر کے میر صاحب نے مرثیہ کے چند بند پڑھے جس سے اہل مجلس پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی اور رزم و بزم کا حق ادا کر کے منبر سے اُترے۔ تمام شہر میں اس مجلس[1] کا شہرہ ہو گیا اور میر صاحب کی خودداری کی دھوم مچ گئی۔ بادشاہ سلامت بھی بہت محظوظ ہوئے اور فتح الدولہ برقؔ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کیوں فتح الدولہ میں نہ کہتا تھا کہ میر انیسؔ لکھنؤ میں ایک ہی شاعر ہیں۔ دیکھا تم نے یہ زبان اُنھیں کے لئے خاص ہے"۔

شاہنامہ اودھ اسی زمانہ میں بادشاہ کو خیال آیا کہ شاہنامہ کے طرز پر انکے خاندانی حالات نظم کئے جائیں۔ اس خدمت کے لئے چار شعرا تجویز ہوئے یعنی فتح الدولہ برقؔ۔ نذیر الدولہ اسیرؔ۔ مرزا مہدی قبولؔ اور میر ببر علی انیسؔ اور یہ بات قرار پائی کہ تھوڑا تھوڑا حصہ تاریخ کا ان چاروں شعرا کو تقسیم کر دیا جائے تاکہ کتاب جلد تمام ہو اور شاعری کی طبیعت کا رنگ بھی علیحدہ علیحدہ نظر آئے۔ میر انیسؔ دربار میں طلب ہوئے اور یہ تجویز پیش کی گئی۔ میر انیسؔ نے اخلاقاً اقرار کر لیا۔ بادشاہ نے نواب علی نقی خاں وزیر کی جناب

---

[1] مولف حیات دبیر نے شاہی مجلس میں بھی میر اور مرزا کی یکجا خواندگی سے انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ دونوں بزرگ ایک مجلس میں کبھی نہیں پڑھے لیکن سلطان عالم کی محفل میں ان دونوں بزرگوں کے جمع ہونے کا قصہ لکھنؤ میں آج تک مشہور ہے۔ ممکن ہے کہ اس واقعہ کی اصلیت ہو اور محفل شاہی قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ ہو۔ واللہ اعلم

اشارہ کیا کہ میر صاحب کے ہمراہ جائیں اور مصاحب منزل کے کمرے دکھائیں جو کمرہ میر صاحب پسند فرمائیں ان کے قیام کیلئے اسباب راحت وہیں جمع کرایا جائے اور یہ کام شروع ہو جائے میر صاحب کو جب معلوم ہوا کہ یہ خدمت پابندی سے لی جائے گی اور شب و روز یہیں رہنا ہوگا بیدل ہو گئے براہ امتثال امر علی نقی خاں کے ہمراہ ہو گئے اور مصاحب منزل کے کمرے دیکھنے لگے آخر پریشان ہو کر بولے :-

غریبوں کی کیا موت کیا زندگی ۰ جگہ جس جگہ مل گئی مر رہے

اور کسی حیلہ سے اس خدمت سے انکار کر دیا۔ شاہنامہ کا سلسلہ شروع ہونے نہیں پایا تھا کہ زمانہ نے سلطنت کا ورق ہی الٹ دیا۔

شاعری کا تاج | ذوجہ میر ضمیر مرحوم کی تقریب چہلم ہیں میر انیس مرثیہ پڑھ رہے تھے رؤسا اور اکابر شہر کے علاوہ شعرائے باکمال کا بھی مجمع تھا۔ خواجہ حیدر علی آتش بھی موجود تھے۔ میر صاحب وہ مرثیہ پڑھ رہے تھے جس کا مطلع ہے :-

آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی ۰ ڈیوڑھی سے چل چکی ہی سواری دلیر کی

تلوار کی تعریف ہیں جب اس شعر کی نوبت آئی۔

اشراف کا بناؤ رئیسوں کی آن ہے ۰ شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

خواجہ آتش کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا کہ "اس بیت کی داد آپ سے چاہتا ہوں" خواجہ کی آزادی اور شوریدہ مزاجی مشہور ہے پہلے سے جھوم رہے تھے۔ یہ بیت سنکر نصف قد کھڑے ہو گئے اور بہ آواز بلند کہا کہ "کون بیوقوف کہتا ہے کہ تم محض مرثیہ گو ہو۔ واللہ ثم باللہ تم شاعر گر ہو اور شاعری کا مقدس تاج تمھارے سر کے لئے موزوں ہے اللہ مبارک کرے۔

معراج کمال | واجد علی شاہ کے آخری زمانہ ہیں میر صاحب کی شہرت معراج کمال

تک پہونچ چکی تھی۔ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر ایک لفظ قدرشناس موتیوں اور جواہرات کی طرح عزیز رکھتے تھے اور ان کا کلام تحفہ کے طور پر دوسرے شہروں میں بھیجا جاتا تھا۔ ایک دن وہ تھا کہ جب میر صاحب نے فرمایا تھا۔

گر قدرداں ہیں کم تو نہ کر اتنا اضطراب   جلدی مدد کرینگے شہ آسماں جناب

اور اب فرماتے ہیں:۔

آباد لکھنؤ رہے تا حشر یا الٰہ   رکھے میرے دوستوں کو جہاں میں بعز و جاہ
یارب ہرا بھرا چمن آرزو رہے   جبتک چمن میں گل رہے اور گل میں بو رہے

آشوب غدر یکایک زمانہ کی ہوا پلٹی۔ وزرا اعمال کی نمک حرامی سے واجد علی شاہ معزول ہوئے۔ کمپنی کا راج ہوا۔ زمین و آسمان بدل گیا اور اسکے بعد ہی غدر کا مہیب فتنہ و فساد برپا ہوا جس نے کمینوں کو امیر اور شریفوں کو ذلیل بنا دیا۔

روستا زادگان دانشمند   بوزیری پادشہ رفتند
پسران وزیر ناقص عقل   بہ گدائی بہ روستا رفتند

تمام علمی ترقیاں دفعتاً رک گئیں۔ اس سال لکھنؤ کا محرم حسرت و عبرت کی دردناک تصویر تھا۔

بادل[1] آ آکے رو گئے ہائے غضب   آنسو نایاب ہو گئے ہائے غضب
جی بھر کے حسینؑ کو نہ روئے اس سال   آنکھوں کے نصیب سو گئے ہائے غضب

مشرقی طرز حکومت کا خدائی دیکھکر کس درد سے کہتا ہے۔

کیونکر دل غمزدہ نہ فریاد کرے   جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ پھر خداوند کریم   اجڑی ہوئی مملکت کو آباد کرے

باغیوں کی عملداری میں میر صاحب گھبرا رہے ہیں۔

---

[1] ۱۸۵۷ء میں محرم اگست کے مہینے میں پڑا اور بھری برسات تھی۔

افسوس زمانہ کا عجب طور ہوا | کیوں چرخ کہن نیا یہ کیا دور ہوا
گردش کب تک نکل چلو جلد انیس | اب یاں کی زمیں اور فلک اور ہوا

مرزا دبیر نے یہ رباعی سن کر تسکین دی۔

کس عہد میں تبدیل نہیں دور ہوا | گہ عدل گئے ظلم گئے جور ہوا
اللہ وہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیر | کیا غم جو زمیں اور فلک اور ہوا

لیکن جب بھگدڑ پڑی اور شرفا روپوش ہونے لگے یہ دونوں بزرگ لکھنؤ سے فرار ہوئے مرزا دبیر کچھ دنوں کے لئے سیتاپور[1] گئے اور میر انیس نے بھی وطن چھوڑا۔ سنا ہے اس عرصہ میں کچھ زمانہ تک وہ کاکوری مقیم رہے۔ جب بغاوت فرو ہوئی امن کا اشتہار جاری ہوا۔ لکھنؤ پھر بسا تو میر صاحب واپس تشریف لائے مگر اختر نگر[2] اجڑ چکا تھا اور اگلی صحبتیں خواب و خیال ہو گئی تھیں۔

میر صاحب کے شیشۂ دل پر سخت چوٹ لگی۔ فرماتے ہیں:

ورق الٹ گیا دنیا کا ایک بار کیوں چرخ | یہ کس طرح کا زمانے میں انقلاب آیا
پیام مرگ ہی ہوئے سفید اے غافل | کبھی سنا ہے کہ پیری گئی شباب آیا
الٹ گیا نقط لکھنؤ کا اک طبقہ | انیس ملک سخن میں بھی انقلاب آیا

غدر کے بعد مکان استھیی محلہ اور رشیدیوں کا احاطہ کھد گیا تو غدر کے بعد میر صاحب نے چند روز محلہ منصور نگر میں قیام کیا وہاں سے راجہ کی بازار تشریف لے گئے پھر

[1] اس خانہ بربادی کے عالم میں مرزا دبیر نے ایک نہایت دردناک رباعی کہی تھی جو عبرت ناظرین کیلئے درج کی جاتی ہے

شطرنج دورنگی سے ہیں ششدر رہنے | آوارہ ہیں شہر شہر در در بندے
اے بندہ نواز ہے تعجب کا محل | تو مالک ملک اور بے گھر بندے

[2] اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کا تخلص اختر تھا اس مناسبت سے لکھنؤ کو اختر نگر کہتے ہیں۔

اے مصحفی لٹ دوں گیا اگلی صحبتوں کو | بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

سبزی منڈی میں ایک مکان خود تعمیر کرایا اور اسی میں رہنے لگے۔ مکان کے قریب ایک مختصر باغ تھا جو اب ویران ہو گیا اور اس جگہ ایک کمرہ بنا ہے جسمیں میر صاحب آرام فرماتے ہیں اور ان کے بعض اعزہ بھی بغل ہی میں آسودہ ہیں۔

پٹنہ عظیم آباد کا سفر جب تک لکھنؤ مرحوم گلزار تھا۔ بلبل بوستانِ امیر کو نقل و حرکت کی ضرورت نہ تھی۔ حیدر آباد سے کئی بار پیام طلب آئے۔ بہار والوں نے بھی بلایا۔ میر صاحب انکار کرتے رہے۔ جب لکھنؤ مٹ گیا اور داد و دہش کا قحط پڑا میر صاحب نے پہلی بار ۱۸۵۹ء میں پہلی بار پٹنہ کا سفر کیا اور ۱۸۶۰ء میں دوسری مرتبہ نواب قاسم علی خاں کی طلب سے عظیم آباد گئے۔ پردیسیوں نے گھر والوں سے زیادہ خاطر و مدارات کی اور ہر سال اس طرف کا سفر معمول ہو گیا۔ ایک سال کسی سبب سے نہ جا سکے تو سال آئندہ کے لئے خاص اہتمام کیا چاروں طرف سے بڑے بڑے رئیس و امیر ارباب علم و کمال میر صاحب کو دیکھنے اور کلام سننے کے لئے وہاں پہونچ گئے۔ ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا سوز خوانی کے بعد دو ڈھائی گھنٹے تک میر مونس منبر پر تحت لفظ پڑھے اور اپنے کمالات ختم کر دیئے۔ جب میر مونس منبر سے اُترے میر صاحب کی باری آئی کچھ تھوڑی دیر حسب معمول چُپ بیٹھے رہے پھر ارشاد فرمایا "صاحبو مجلس کو بہت طول ہو گیا اور غالباً آپ حضرات میر مونس کو سُنکر سیر ہو گئے ہوں گے اب فریضۂ ظہر کا وقت آ گیا جس کو جناب سید الشہداؑ نے تلوار کی دھاروں میں ادا فرمایا ہے میں نماز پڑھ لینا چاہتا ہوں آپ بھی نماز سے فارغ ہو لیں پھر جن صاحبوں کو انیس کا سننا منظور ہو وہ تشریف لائیں اور جو میر مونس کو سن کر سیر ہو چکے وہ اپنے گھروں میں آرام فرمائیں"۔ اس تقریر نے ایک عام مایوسی پیدا کر دی۔ میر صاحب نماز پڑھنے چلے گئے۔ تمام اہل مجلس اُٹھ کھڑے ہوئے

تو عالی شان مجمع برخاست ہوگیا۔ بعضوں کو خیال ہوا کہ اب ایسا مجمع دشوار ہے ایک گھنٹہ بھی نہ گذرا تھا کہ ان حضرات نے پھر معاودت فرمائی اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لائے جو اس سے پہلے شریک نہ تھے جب میر صاحب کو معلوم ہوا کہ مجلس تیار ہے خراماں خراماں تشریف لائے اور منبر پر جا کر فرمایا حضرات مجھ کو اس کا اندازہ کرنا منظور تھا کہ انیس کے دیکھنے والے کتنے ہیں الحمدللہ آپ صاحبوں نے قدردانی کا ثبوت دیا" یہ کہہ کر ساری مجلس کو گرویدہ کرلیا اور دو چار رباعیاں پڑھ کر یہ مرثیہ شروع کیا۔

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے	جلوہ کیا سحر کے رُخ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہ گردوں رکاب نے	مُڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے

آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

اس مرثیہ کے مسجع بندوں نے سخن شناس طبائع پر جو اثر کیا بیان ہو نہیں سکتا رزمیہ بندوں کے ہر شعر پر واہ واہ سبحان اللہ کی آوازوں سے تمام مکان گونج رہا تھا اور رنج و الم کے جانکاہ بندوں پر دلوں میں بجلیاں تڑپتی تھیں میر صاحب نے کئی مرتبہ چاہا کہ مرثیہ ختم کریں لیکن ساری مجلس کے اصرار نے جب تک پورا مرثیہ نہ سن لیا اُن کا منبر سے اترنا قبول نہ کیا بلکہ اکثر جوہر شناس مقطع کا بند سن کر غمزدہ ہوئے کہ ابھی کیوں مرثیہ ختم ہو گیا۔

حیدرآباد کا سفر | ۱۸۷۱ء میں نواب تہور جنگ بہادر نے میر صاحب کو حیدرآباد طلب کیا۔ یہ طلبی دراصل سر سالار جنگ بہادر مدار المہام سلطنت عالیہ کی طرف سے تھی۔ میر صاحب جانا نہیں چاہتے تھے چند معززین کی سفارش سے مجبور ہو کر حیدرآباد تشریف لے گئے۔ اس وقت تک براہ راست ریلوے

لائن جاری نہیں تھی۔ کچھ دُور تک گھوڑا گاڑی پر سفر کر کے براہ گلبرگہ حیدرآباد پہونچے اور سفر کی زحمت سے بیمار ہو گئے۔ مجلس میں حیدر کے تمام امرا و شرفا شریک تھے۔ ہزاروں آدمی مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے تھے اور ایک جم غفیر جس کو اندر جانے کی گنجائش نہیں ملی باہر کھڑا ہوا تھا۔ میر انیس تپ میں مبتلا تھے انھوں نے مجلس پڑھنے سے انکار کر دیا فقرہ بازوں نے خبر اڑادی کہ میر انیس کی علالت مزاج صرف بہانہ ہے وہ حیدرآباد آئے ہی نہیں۔ نواب تہور جنگ نے عرض کی کہ حضور منبر پر تشریف لیجائیں اور صرف ایک رباعی پڑھ کر اتر آئیں کیونکہ دشمنوں نے میری رسوائی کے لئے آپ کے تشریف نہ لانے کی خبر تمام شہر میں اڑا دی ہے۔ میر صاحب نے فرمایا مجھ میں بالکل قوت نہیں ہے اور نہ میرے ہوش و حواس درست ہیں۔ تجویز ہوئی کہ کسی کسی حاذق سے میر صاحب کا معالجہ رجوع کیا جائے تاکہ تپ کم ہو کچھ بھی طاقت پیدا ہو جائے تو پھر خوشامد کر کے اپنا مطلب پورا کرلیں۔ یہ صلاح پسند ہوئی اور کئی حکیموں کے نام پر استخارہ دیکھا گیا۔ ایک ڈاکٹر کے نام پر استخارہ واجب آیا۔ میر صاحب ڈاکٹر کا نام سن کے متعجب ہوئے اور کہا کہ میں نے کبھی ڈاکٹر کا علاج نہیں کیا ہے ڈاکٹر اپنے معمولات میں شراب کو ہر ایک مرکب کا جزو اعظم سمجھتے ہیں میں اُنکی دوا استعمال نہیں کروں گا۔ کہا گیا کہ ڈاکٹر صاحب مسلمان ہیں کوئی دوا خلاف شریعت نہ دیں گے۔ میر صاحب کا شک دور ہوا ڈاکٹر نے تپ اتارنے کی دوا دی۔ میر صاحب کو تھوڑی دیر تک پسینہ آتا رہا اور پھر بخار یک لخت اُتر گیا اگرچہ کسل تھا مگر ارکان سلطنت کی خوشامد سے مجبور ہو کر مجلس میں تشریف لائے۔ ذیل کی دو رباعیاں فی البدیہہ تصنیف فرما کر پڑھیں اور منبر سے اُتر آئے۔

رُباعی

اللہ و رسول حق کی امداد رہے　　　سرسبز یہ شہر فیض بنیاد رہے
نواب ایسا رئیس اعظم ایسے　　　یارب آباد حیدرآباد رہے

رُباعی

موجود ہی جو کچھ جسے منظور رہی یاں　　　علم و عمل و عطا کا دستور رہے یاں
مختار الملک اور بندگان عالی　　　رحمت رحمت پہ نور پر نور رہی یاں

جب طبیعت کسی قدر درست ہوئی میر صاحب نے مرثیہ پڑھا لیکن اختصار کا قصد کیا سامعین نے تقاضا کیا حضور خدا کے لئے ہم سب جانیں لڑائے ہوئے ہیں۔ میر صاحب نے فرمایا کیا خوب آپ کی جانیں لڑی ہیں تو میں کیا کروں میری تو جان پر بنی ہے۔

ایک اور مجلس میں میر صاحب مرثیہ کے بارہ بندوں تک پہونچے تھے دفعتہً خیال گذرا کہ سامعین کو پوری توجہ نہیں ہے بے دل ہو کر حاضرین پر ایک نظر ڈالی مرثیہ توڑ کر زانو پر رکھ لیا اور حسرتناک آواز سے فرمایا "ہائے لکھنؤ تجھے کہاں سے لاؤں"! پھر ناسازی طبیعت کا بہانہ کر کے منبر سے اُتر آئے"۔

تمام ارباب مجلس مہینوں اس مرثیہ خوانی کا ذکر کرتے اور اُن کے طرز بیان کو یاد کر کے مزے لیتے رہے۔ رخصت کے وقت سر سالار جنگ نے سات ہزار اور نواب تہور جنگ نے تین ہزار روپیہ پیش کئے اور آمد و رفت کا خرچ علیحدہ دیا۔ ان مجالس کی شہرت ہونے کے بعد سر آسمان جاہ بہادر نے چاہا کہ میر انیس ان کے یہاں مجلس پڑھیں اور اپنی ٹوپی کی جگہ حیدرآباد کی پگڑی رکھ کر زیب مجلس ہوں تو پانچہزار روپیہ نذر کیا جائے گا۔ لیکن میر صاحب

نے اپنی ٹوپی اتار کر حیدر آباد کی پگڑی رکھنا قبول نہ کیا۔

حیدر آباد میں ایک سلام ایک مرتبہ حیدر آباد کے ایک رئیس اعظم مجلس میں تشریف لائے لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ ممبر کے قریب پہونچایا ہمعصروں نے سروقد تعظیم دی میر صاحب نے فقط اتنا ہی کہا کہ بسم اللہ۔ میر صاحب کا تعظیم کے لئے کھڑا نہ ہونا رئیس مذکور کے خلاف مزاج ہوا انھوں نے اپنے مصاحبوں سے خفیہ طور پر کہا کہ ان کی مرثیہ خوانی کی تعریف نہ کی جائے میر صاحب اس سرگوشی کو تاڑ گئے جب منبر پر تشریف لے گئے تو چند رباعیوں کے بعد یہ سلام شروع کیا۔

ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے
اڑ گیا جب رنگ رخ سے استخواں پیدا ہوئے

پہلے ہی شعر پر رئیس مذکور کو جنبش ہوئی۔ دوسرا شعر شروع کرنے سے پہلے میر صاحب نے رئیس سے مخاطب ہو کر فرمایا "سنیئے یہ آپ کے سننے کا شعر ہے"

نوبت جمشید و دارا و سکندر اب کہاں
خاک تک چھائی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

نواب بے اختیار تعریف کرنے لگے۔ پھر تیسرا شعر پڑھا۔

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں
اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

بس اب پورا رنگ جم چکا تھا چوتھے شعر نے ساری مجلس کو بیتاب کر دیا۔

بود نابود علی اصغر کا کیا کیجیے بیاں
بے زباں دنیا سے اٹھے بے زباں پیدا ہوئے

اہل دکن کی قدردانی میر صاحب پہلے تو اہل دکن کو نافہم و ناداں سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ جن محاسن پر انھیں ناز ہے جس شاعری پر وہ فخر و مباہات کرتے

ہیں اس کے لئے زباندانی درکار ہے۔

یک بیک ایسا زمانہ میں ہوا ہے انقلاب
قدرداں سب اٹھ گئے ناقدرداں پیدا ہوئے

آخر میں میر صاحب کو ان کی سخن فہمی کا اعتراف ہوا رؤسائے شہر نے ایسی قدرشناسی کی کہ ایک مرتبہ بعد ختم مجلس نواب مہور جنگ بہادر میر صاحب کو فینس میں سوار کرنے کے لئے دروازے تک تشریف لائے اور میر انیس کی نعلین اپنے ہاتھ سے اٹھا کر فینس میں رکھیں۔

الہ آباد کی مجلس — جب میر انیس الہ آباد تشریف لے گئے ان کی آمد کی عام اطلاع کے لئے اشتہار شائع کرائے گئے۔ کالج اور مدرسہ میں ایک روز کی تعطیل ہوئی تمام کچہریوں میں اہل عملہ کو شرکت کی اجازت دی گئی۔

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ سابق پروفیسر عربی الہ آباد کالج بیان کرتے ہیں جب میں اس مجلس میں پہنچا عالیشان مکان شائقین سے بھر چکا تھا سیکڑوں مشتاق دھوپ میں کھڑے ہوئے محو سماعت تھے مرثیہ شروع ہو چکا تھا اور میرا مجلس کے اندر جگہ پانا ناممکن تھا اس لئے میں بھی دھوپ میں کھڑا ہو کر سننے لگا۔ اس وقت میر انیس بوڑھے ہو چکے تھے مگر انکا طرز بیان جوانوں کو مات کرتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ منبر پر ایک کل کی بڑھیا بیٹھی جادو کر رہی ہے۔ خلق خدا کا دل جس طرف چاہتی ہے پھیر دیتی ہے کبھی ہنساتی ہے کبھی رلاتی ہے میں اسی حالت میں دو گھنٹے کے قریب کھڑا رہا میرے کپڑے پسینے سے تر اور پاؤں شل ہو گئے لیکن دلچسپی اور محویت کا یہ عالم تھا کہ جب تک میر انیس کی صورت دیکھتا رہا، کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔

بنارس کی مجلس | ایک مرتبہ میر صاحب پٹنہ سے واپسی کے وقت بنارس میں مجلس پڑھنے کے لئے مقیم ہوئے یہ مجلس قاضی میر یار علی کے امامباڑہ واقع تیلیانالہ میں منعقد ہوئی تھی۔ اس وقت میر انیس، میر انس، میر مونس، میر نفیس، میر وحید پانچوں[۱] حضرات رونق محفل تھے۔ پہلے میر وحید نے پیش خوانی کی پھر نفیس پڑھے ان کے بعد میر مونس اور میر انس یکے بعد دیگرے منبر پر تشریف لے گئے۔ میر انس برابر کے بھائی تھے انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی مرثیہ نے خوب رنگ جما دیا اور گریہ بے حد ہوا۔ جب میر انیس سے صاحب خانہ نے درخواست کی میر صاحب نے فرمایا کہ آل مجلس ہو چکا میر انس ماشاء اللہ خوب پڑھے اب میری کوئی ضرورت نہیں مگر صاحب خانہ نے دست بستہ عرض کی کہ یہاں سب حضور ہی کے مشتاق ہیں ان کو اس سعادت سے محروم نہ رکھئے آخر میر صاحب مجبور ہوئے اور فرمایا کہ حاضرین مجلس کسلمند اور خستہ ہیں تھوڑی دیر آرام کریں پھر میں پڑھوں گا حقہ کا دور شروع ہوا نصف گھنٹہ کا وقفہ دے کر میر صاحب منبر پر تشریف لے گئے اور مرثیہ ایسا پڑھا کہ اہل مجلس گزشتہ واقعات کو بھول گئے۔[۲]

خاکسار جامع اوراق ۱۹۱۵ء میں بسلسلۂ ملازمت بنارس میں تھا اس وقت تک یہ مجلس وہاں کے کہن سال بزرگوں کو یاد تھی اور میر صاحب کا انداز مرثیہ خوانی فراموش نہیں ہوا تھا۔

لطیفہ عا | ایک مرتبہ میر صاحب پٹنہ تشریف لیے جا رہے تھے۔ کانپور کے

---

[۱] میر انس اور میر مونس میر صاحب کے بھائی تھے۔ میر نفیس صاحبزادے تھے اور میر وحید بھتیجے تھے یعنی میر انس کے لڑکے ۱۲

[۲] اس تالیف میں بیشتر قصص و حکایات حیات انیس (اشہری) واقعات انیس (احسن)

اسٹیشن پر لکھنؤ کے ایک امیرزادے نواب زبدۃ الدولہ بہادر جن سے میر صاحب آشنا نہ تھے ملے۔ یہ رئیس زادے اسوقت ایک حبشی اطلس کا لبادہ پہنے ہوئے تھے جس کا ریشم دھوپ کے عکس سے چمک رہا تھا۔ میر صاحب نے اپنے ایک ہمراہی سے پوچھا یہ کون صاحب ہیں ہمراہی نے عرض کی کہ جنرل ذوالفقار الدولہ کے صاحبزادہ ہیں ان کا نام میر سید محمد اور خطاب زبدۃ الدولہ ہے میر صاحب نے مسکرا کر کہا جب ہی فرغ زرّیں پہنے ہوئے ہیں صاحب بادشاہی متوسلین سے ہیں۔

لطیفہ ۲ | میر صاحب تپ میں مبتلا تھے مفتی میر عباس صاحب عیادت کو تشریف لائے نبض دیکھ کر فرمایا اب تو بخار خفیف ہو گیا ہے۔ میر صاحب نے فرمایا کہ ایک مشت استخواں کی ناتوانی دیکھ کر ایسا خفیف ہو گیا ہے کہ شاید کمبخت اب منہ نہ دکھائے گا۔

لطیفہ ۳ | ایک ملازم کو کسی کام کو بھیجا واپس آنے میں دیر ہوئی۔ میر صاحب غصہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ملازم آیا اور ایک عجیب و غریب قصہ بیان کیا کہ چوک سے ایک برات جاتی تھی اس کے دو اونٹ آپس میں لڑ رہے تھے اس لئے واپسی میں دیر ہوئی۔ میر صاحب مسکرائے اور فرمایا تو صاف کیوں نہیں کہتے کہ جنگ جمل کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

لطیفہ ۴ | میر انیس کو ایک امیر نے مدعو کیا کھانے کے بعد آم آئے مجمع احباب میں ایک حکیم صاحب بھی تھے کسی نے پوچھا کیوں حکیم صاحب آم کھانا کیسا ہے حکیم صاحب نے جواب دیا کہ آم کا مزاج حار ہے اور آجکل فصل بھی گرم ہے پانی کھل کر نہیں برسا ہے اسلیئے احتیاطاً مناسب ہے، اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۲) اور حیات دبیر (ثابت) سے اخذ کیے گئے ہیں لیکن بعض روایات ایسی بھی شامل ہیں جو راقم حروف کو سینہ بہ سینہ پہونچی ہیں ۱۲

دوران میں احباب نے آم اچھے چھانٹ کر کھانا شروع کر دیے۔ حکیم صاحب نے چند آم ایک قاب میں علیحدہ رکھ لئے تاکہ دلجمی سے سیر ہو کر کھائیں، کسی نے کہا "حکیم صاحب ہمیں تو آم کھانے سے منع کرتے تھے اور اپنے لیے یہ سامان جمع کرتے ہیں"۔ حکیم صاحب بولنے نہ پائے تھے کہ میر صاحب نے فرمایا "فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ"۔

لطیفہ ۵ میر انیس الہ آباد تشریف لے گئے وہاں کے میزبان نے منجملہ اور لوازم ضیافت کے ایک من برف کی سل بھیجی۔ میر صاحب کے رفیقوں میں سے ایک نے گڑھا کھود کر برف کی سل اس میں رکھ دی تاکہ بقدر ضرورت نکالتے رہیں۔ شام کو وہ رئیس تشریف لائے اور برف کا ذکر آیا۔ میر صاحب نے فرمایا آپ نے حاتم کا کام کیا تھا، مگر میرے رفیق نے قارون کی طرح زمین میں دفن کیا تاکہ وہ چاندی کا ڈلا پانی ہو کر بہ نہ جائے۔

لطیفہ ۶ جناب عشق میر صاحب کے ایک ہمعصر شاعر اور رشتہ دار سے اتفاق سے کچھ بے لطفی ہو گئی اور طرفین کی بیگمات نے بات بڑھا دی۔ ایک روز جناب عشق کا ذکر آیا۔ میر صاحب برافروختہ ہو رہے تھے فرمایا میں عشق کو خوب جانتا ہوں ان کو پہلے ایک بات نکالنا اور پھر رونا دھونا خوب آتا ہے۔

عشق ہی تازہ کا تازہ خیال ہر جگہ اسکی اک نئی چال ہے
کہیں آنسو کی یہ روایت ہے کہیں یہ خونچکاں حکایت ہے

یہ اشعار میر تقی میر کے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع کے لئے کہے تھے۔

لطیفہ ۷ مرزا دبیر نے ایک بے نقط مرثیہ کہا جس کا مطلع ہے۔

ہم علم سرور اکرم ہوا طالع

ایک صاحب نے میر انیس سے ذکر کیا کہ مرزا دبیر نے ایک مرثیہ کہا ہے جس میں

اول سے آخر تک کوئی حرف نقطہ دار نہیں آیا ہے میر صاحب مسکرا کر بولے یہ کہئے سر سے پاؤں تک مہمل ہے جو لوگ جانتے تھے کہ اس صنعت کو مہملہ کہتے ہیں وہ میر صاحب کے لطف بیان سے محفوظ ہوئے۔

لطیفہ ۸ مفتی میر عباس اور جناب انیس میں محبت قلبی تھی کسی بات پر کچھ شکر رنجی ہوئی۔ مفتی صاحب نے ایک رقعہ میر انیس کے پاس روانہ کیا۔ انیس نے لفافہ پر یہ لکھ کر واپس کر دیا۔ شعر

مرنجان دلم را کہ این مرغ وحشی زبامے کہ برخاست مشکل نشیند

لطیفہ ۹ میر صاحب کے زمانہ میں رعایت لفظی کی بلا لکھنؤ پر مسلط تھی اور اس کے اثر سے مجبور ہو کر میر صاحب بھی بعض اشعار میں اس رعایت کا لحاظ کرتے تھے کسی شخص نے میر صاحب سے پوچھا کیا آپ رعایت لفظی کو پسند کرتے ہیں فرمایا کیا کروں لکھنؤ میں رہنا ہے۔

لطیفہ ۱۰ میر صاحب کو اپنے گھر کی زبان پر ناز تھا اور وہ بعض محاورات میں اہل لکھنؤ کی تقلید نہیں کرتے تھے تاہم یہاں کی زبان کو دہلی کی مروجہ اردو سے بہتر سمجھتے تھے۔ میر صاحب کے ایک دوست دہلی جانے لگے ان سے فرمایا تم دہلی جاتے ہو تو تمھاری زبان بگڑ جائے گی پھر وہی ورے پرے بولنے لگوگے۔

حکایت ۱۱ ایک نواب صاحب میر انیس کی خدمت میں مرثیہ کی مشق فرماتے تھے اتفاق سے کھجانے کی ضرورت محسوس ہوئی ضبط نہ کر سکے۔ دامن ہٹا کر پیٹ کھجانے لگے میر صاحب نے کنکھیوں سے دیکھا اور خاموش ہو رہے جب کھجانے کا سلسلہ دیر تک جاری رہا میر صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا فرمایا کہ مرثیہ رکھ دو اور اچھی طرح کھجا لو۔ مرثیہ پڑھنے اور اس بدتمیزی سے کیا علاقہ۔ نواب صاحب نے معافی چاہی میر صاحب نے فرمایا" نہیں صاحب کھجائیے اور اچھی طرح

کھجایئے" آپ نے مرثیہ کی تعلیم دھرپد اور ٹپے کی تعلیم سمجھی ہے کہ گاتے بھی جاتے ہیں اور کھجاتے بھی جاتے ہیں۔

حکایت ۲ میر صاحب چاہتے تھے کہ دوران مرثیہ خوانی میں کوئی صاحب آئیں تو جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھ جائیں وہ اکثر فرماتے تھے کہ انیس کے مشتاق ہوں گے تو پہلے سے تشریف لاکر کشمکش کی زحمت نہ اٹھائیں گے ورنہ بانی مجلس کی خاطر سے آنے والے قدردان انیس نہیں ہیں اور نہ انیس کو اُن کے حفظ مراتب کی ضرورت ہے۔ ایک مرتبہ دوران مرثیہ خوانی میں ایک رئیس تشریف لائے اور چاہا کہ کسی طرح صفیں چیرتے پھاندتے منبر کے قریب پہنچ جائیں میر صاحب سمجھ گئے اور اپنی رعب دار آواز سے فرمایا کہ بس وہیں بیٹھ جاؤ ایک قدم آگے نہ بڑھانا۔ رئیس نے وہیں غوطہ مارا اور میر صاحب کی بے اعتنائی کی پروا نہ کی۔

حکایت ۳ ایک مرتبہ میر صاحب کی طبیعت کسلمند تھی آواز خستہ ہو گئی تھی شائقین نے مجلس پڑھنے کا اصرار کیا۔ آپ منبر پر تشریف لے گئے، اور حسب ذیل رباعی فی البدیہہ تصنیف کرکے پڑھی۔

ہر چند کہ خستہ و حزیں ہے آواز
پر تعزیہ دار شاہِ دیں ہے آواز
نکلے نہ اگر کنج دہن سے تو بجا
ماتم کے ہیں دن سوگ نشیں ہے آواز

حکایت ۴ گرمی کا موسم تھا اور مشتاقوں کے ہجوم نے مجلس میں سانس لینا دشوار کر دیا تھا۔ میر صاحب نے ارشاد فرمایا:۔

دھوپ آ کے یہاں پہ زرد ہو جاتی ہے
آندھی آئے تو گرد ہو جاتی ہے
آہوں کے ہیں پنکھے آنسوؤں کا چھڑکاؤ
یاں گرم ہوا بھی سرد ہو جاتی ہے

حکایت ۵ شہادت علی اصغر کے احوال میں ایک دردناک مرثیہ

میر صاحب نے سخت بیماری کی حالت میں کہا تھا اُس کے مقطع میں عرض کرتے ہیں:۔
دفنِ علی اصغر کا ہے پُردرد بہت حال — کرشہ سے یہی عرض کہ اے فاطمہ کے لال
بیمار انیسؔ جگر افگار ہے امسال — یہ میرا مرض دُور ہو یا دور رہے اقبال

ہو وادرسِ خلق مری داد کو پہونچو
اے شاہِ شہیداں مری امداد کو پہونچو

اسی حالت میں وہ مرثیہ بھی کہا جس کا مطلع ہے ع
جب کہ تیر دل سے بدن شاہ کا غربال ہوا

اس کے مقطع میں دعا مانگتے ہیں۔

یا حسین ابن علی قبلۂ دیں شاہ انام — سخت ایذا میں گرفتار ہے حضرت کا غلام
مضطرب ہوں مدد اے یاشہ ذیشاں مدد اے — وقت مشکل ہے مددگارِ غریباں مدد اے

اس مرثیہ میں وہ مشہور شعر بھی ہے جو بعد کو مرزا دبیر کی نازک خیالی سے ترقی پاکر سہل ممتنع ہو گیا میر صاحب نے فرمایا تھا۔

حلق پر تیغ ہو اور سینہ پہ ہوئے جلّاد — ہے یہ امید کہ اس دم بھی نہ بھولے تری یاد
نہ غم اہل حرم ہو نہ خیال اولاد — کان تک میرے سکینہ کی نہ پہنچے فریاد

دھیان بیٹے کا نہ بیٹی کا نہ ہمشیر کا ہو
ذکر تسبیح کا تہلیل کا تکبیر کا ہو

مرزا دبیر نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے۔

تو شہنشاہ شہنشاہوں کا ہے یا رخدا — ہیں برابر تری درگاہ میں سب شاہ و گدا
خاطر عاشق جانباز ہے البتہ جدا — اے **خوشا حال** کہ مجھ سے ہو ترا عشق ادا

حلق پر تیغ رہے سینہ پہ جلّاد رہے
لب پہ ہو نام ترا دل میں تری یاد رہے

سبحان اللہ! کس قدر صاف بندش ہے اور کیسا موثر طرز بیان!! دونوں بزرگوں نے ایک ہی مضمون نظم کیا مگر مرزا صاحب نے "لب پہ ہو نام ترا" اضافہ کرکے شعر میں جان ڈال دی اور میر انیس کا سارا بند اپنی ٹیپ سے گرد کر دیا۔

حکایت جس سال میر صاحب پہلی مرتبہ عظیم آباد تشریف لے گئے ایک شخص نے اُن کا کلام سن کر اعتراض کیا کہ مرثیہ گویان لکھنؤ حضرات اہلبیت کا صبر و شکر کرنے کے بجائے بعض اوقات ایسی باتیں نظم کرتے ہیں جو صبر و رضا کے بالکل منافی ہیں۔ یہ خبر جب انیس تک پہونچی آپ نے فرمایا کہ جو صاحب معترض ہیں وہ دس بند ہی ایسے کہہ کر سنا دیں جن میں صحیح روایات سے متعلق تجاوز نہ ہو اور پھر کلام موثر و مبکی ہو۔

حکایت میر صاحب کے باکمال نواسے پیارے صاحب رشید کا عنفوان شباب کا زمانہ اور مشق سخن کی ابتدا تھی۔ انھوں نے غزل کہی نانا کے پاس اصلاح کو لے گئے مصرع طرح یہ تھا۔ ع وصل کی شب ان سے باتوں میں سحر ہو جائیگی۔ جد امجد کو خوش پاکر عرض کی کہ آپ بھی اسی طرح میں غزل کہیں۔ پیارے نواسے کو گلے لگا کر ارشاد فرمایا "بیٹا مرثیہ ہماری غزل ہے اچھا اب کی مجلس میں تمھاری خوشی کریں گے اور غزل پڑھیں گے۔ چند روز کے بعد دل آرام کی بارہ دری میں مجلس تھی، دو رباعیاں پڑھنے کے بعد فرمایا کہ پیارے ہماری

لہ نا فہم کہتے ہیں کہ یہ حکایت "یادگار" سے نکال ڈال۔ اس قصہ سے میر صاحب کی تنقیص ہوتی ہے، اور اگر اس کے درج کرنے پر اصرار ہے تو یہ شعر بھی لکھ دے۔

گاہ باشد کہ کودکے ناداں — از غلط بر ہدف زند تیرے

نقل کفر کفر نہ باشد۔ مرزا صاحب کی شان میں راقم الحروف ایسی گستاخی نہیں کرسکتا اور نہ اس حکایت کو حذف کرکے انصاف کے گلے پر چھری چلا سکتا ہے ۱۲

غزل سنو۔ اور اس زمین میں ایک درد انگیز سلام پڑھا جس کا ایک شعر مولف حیات دبیر نے اس حکایت کے ساتھ اپنی دلچسپ تالیف میں نقل کیا ہے۔

کہتے تھے سرور علی اکبر کا مرنا ہائے ہائے کیا غضب ہوگا جو صغرا کو خبر ہو جائیگی

حکایت ۸ میر صاحب کے سامنے کسی شخص نے جرأت کا یہ شعر پڑھا:۔

ہمارے سر پہ چھائی ہیں بلائیں شام ہجراں کی
وہ اپنے شغل میں ہیں بال ادھر کھولے ادھر باندھے

آپ نے بہت تعریف کی اور اپنے دونوں ہاتھ کانوں کے پاس لے جا کے اور چاروں انگلیوں کو یکے بعد دیگرے ایک ڈوری حرکت دے کے دوسرے مصرعہ کو اس طریقہ سے ادا کیا کہ آراستگی زلف کی تصویر حاضرین کے سامنے کھنچ گئی۔

حکایت ۹ میر صاحب ایک روز لب سڑک بیٹھے ہوئے تھے، ایک رئیس کی گاڑی سامنے سے گزری رئیس نے کوچوان سے اشارہ کیا کہ گاڑی آہستہ لے چلے تاکہ میر صاحب متوجہ ہوں تو سلام کر لے میر صاحب نے فوراً ارادہ سمجھ لیا اور اس جانب سے منھ پھیر کر کسی اور شخص سے گفتگو کرنے لگے۔ جب گاڑی نکل گئی فرمایا کہ اس شخص کی صورت سے مجھے نفرت ہے اس نے سلطنت سے بے ایمانی کی اور ہزاروں بے گناہوں کی گردنوں پر چھری پھیری ہے۔ میں کیا ہوں رحمت خدا نے بھی ان لوگوں کی طرف سے منھ پھیر لیا ہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ ماہ رمضان میں نماز جماعت کے لئے تحسین کی مسجد میں تشریف لے گئے وہاں بھی ایک رئیس نے میر صاحب کو مخاطب کرنا چاہا انھوں نے منھ پھیر لیا اور دوسرے شخص سے باتیں کرنے لگے کسی نے عرض کی کہ فلاں رئیس امیدوار سلام ہیں۔ میر صاحب نے دوسری جانب رُخ پھیر کر فرمایا کہاں اس نے رئیس کی طرف اشارہ کرکے کہا ادھر میر صاحب نے تیسری

جانب رُخ پھیر کر فرمایا کہاں ہیں آخر وہ رئیس شرمندہ ہو کر بیٹھ گئے اور میر صاحب مُسکراتے ہوئے نماز کو کھڑے ہو گئے۔

حکایت ۱۱۶ داروغہ اچھے صاحب ایک بزرگ لکھنؤ میں میر صاحب کے شاگرد تھے سال بھر بعد ایک مجلس بڑی دھوم دھام سے کرتے اور تمام روسا شہر اور شرفا کو بلاتے تھے اُن کو مرثیہ خوانی کا بڑا دعویٰ تھا۔ ایک مرتبہ میر انیس کا نیا مرثیہ پڑھے۔ میر صاحب بھی موجود تھے۔ داروغہ صاحب نے اپنی دانست میں مرثیہ خوانی کے خوب جوہر دکھائے اور بڑے فخر و مباہات سے مرثیہ تمام کیا۔ جب مجلس ختم ہو گئی میر صاحب نے اپنے ایک حاضر باش سے فرمایا کہ آپ نے داروغہ صاحب کا پڑھنا دیکھا انھوں نے تعریف کی میر انیس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور بولے تم ایسا کہتے ہو میرے مرثیہ کی ہڈیاں پسلیاں توڑ دیں میرے مضامین پر ظلم کیا میرے قلب پر جو کچھ صدمہ گذرا ہے اس کو میں ہی خوب جانتا ہوں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ داروغہ صاحب کی فینس آ گئی میر صاحب فرمانے لگے دیکھئے یہاں بھی مجھ سے داد لینے آئے ہیں لیکن جوں ہی داروغہ صاحب فینس سے اترے میر انیس نے فرمایا کہ "اچھے صاحب آج کی مجلس یادگار پڑھے ہو۔ میں حیران ہوں کہ میرے خیالات شاعری کے لیے تم میں جذبات خواندگی کہاں سے پیدا ہو جاتے ہیں داروغہ صاحب نے تسلیم کی اور اٹھ بیٹھے۔ میر انیس پھر سلسلۂ تعریف شروع کیا داروغہ صاحب کھڑے ہو گئے اور پھر فرشی سلام کیا۔ اس ترکیب سے دس پانچ مرتبہ داروغہ صاحب کو اُٹھ بیٹھ کرنا پڑی پھر میر صاحب نے اپنے صاحبزادے کو بُلایا اور ان سے مخاطب ہو کر تعریف شروع کی "دیکھیں خورشید علی تم نے اچھے صاحب کا پڑھنا،، صاحبزادے

نے بھی تعریف کی۔ میر صاحب نے فرمایا کہ "خدا جانے آجتک اس مرثیہ کو میں کیا پڑھتا اور ہم کیا پڑھتے۔ مرثیہ کے جوہر تو آج داروغہ صاحب کے پڑھنے سے کھلے ہیں" داروغہ صاحب اس مبالغہ پر پھول گئے اور حقیقت امر کو نہ سمجھے

بحر لکھنوی | لکھنؤ کے مشہور شاعر شیخ امداد علی بحر میر انیس کی خدمت میں اکثر تشریف لاتے اور اپنا کلام سنایا کرتے تھے ایک روز میر صاحب کے سامنے ایک مطلع پڑھا جس کی مشاعرہ میں بہت تعریف ہوئی تھی اور داد کے امیدوار ہوئے۔ میر صاحب سن کر خاموش ہو گئے۔ شیخ صاحب نے دوبارہ داد چاہی۔ میر صاحب کو ان کی اس حرکت سے غصہ آگیا۔ فرمایا کہ میں نہیں سمجھتا اس کی تعریف اہل مشاعرہ نے کیا سمجھ کر کی اس میں ایک ترکیب خلاف محاورہ واقع ہوئی ہے۔ مطلع یہ تھا ؎

حور بنکر ترے کشتے کی قضا آتی ہے   دامن تیغ سے جنت کی ہوا آتی ہے

میر صاحب کا اعتراض تھا کہ دامن تیغ خلاف محاورہ ہے دامن شمشیر چاہیئے۔ شیخ صاحب نے اسکی محاورہ کی تلاش میں ایرانیوں کا کلام چھان ڈالا۔ کہیں پتہ نہ چلا

شیخ صاحب اکثر یہ فرمائش میر صاحب سے کیا کرتے تھے کہ حضور میرا دیوان ایک مرتبہ ملاحظہ فرما کر اصلاح سے مزین فرمائیں۔ میر صاحب ٹال دیا کرتے تھے اور جب وہ چلے جاتے میر صاحب فرماتے کہ واللہ جو اس کی شاعری کچھ بھی سمجھ میں آتی ہو۔ کچھ عجب مہمل کلام ہے۔

غم سے آگے ہیں بال ہمارے سفید بحر   سر میں پھپھوندی لگ گئی آنکھوں کی سیل سے

سالک | مرزا غالب کے مشہور شاگرد میر قربان علی سالک[1] ۱۸۶۱ء میں لکھنؤ

---

[1] خواجہ الطاف حسین حالی نے سالک کا نام ایک قطعہ میں اس طرح لیا ہے۔

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیر باقی   وحشت ہے نہ سالک نہ انور باقی

تشریف لائے تھے وہ اپنی بیاض میں تحریر فرماتے ہیں "میں دو مہینے سے لکھنؤ میں وارد ہوں۔ دلّی میں مرزا غالب اور استاد ذوق کی چوٹیں دیکھتا سُنتا تھا مگر یہاں میر انیس اور مرزا دبیر کی معرکہ آرائی کا عالم نرالا ہی ایک طرف کا معتقد دوسری طرف والوں میں ایسا دیکھا جاتا ہے جیسا موحدین میں مشرک اور مُسلمانوں میں کافر۔ میں نے اپنے آپ کو میر انیس کے طرفداروں میں شامل کیا ہے۔ ایک روز میر صاحب سے دلی کا ذکر آ گیا۔ طرز بیان سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب تک ان کے دل میں دلّی بسی ہوئی ہے اپنی جائے سکونت (سبزی منڈی) کو فرمانے لگے یہ ہی باغ کا سبزہ زار ہی۔ مرزا غالب کو یگانۂ فن کے لفظ سے یاد کیا اور ذوق اور مومن کی نسبت فرمایا کہ ذوق شاہی دربار کے شاعر۔ اور مومن اپنی طبیعت کے بادشاہ ہیں۔ پھر حکیم مومن خاں کا یہ شعر پڑھا۔

نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی — بگڑنے میں بھی زلف اسکی بنا کی

پڑھنے کے بعد ایک چپ سی لگ گئی جیسے کوئی ایک حسین عورت سامنے ہے اور ہوا سے اسکی زلف اُڑ رہی ہے اور میر صاحب اس کو دیکھ دیکھ کر ادائے کلام کے مزے لے رہے ہیں۔ ایک روز فرمانے لگے دلّی کا کچھ کلام سُناؤ میں نے مرزا غالب کی یہ غزل پڑھی:۔

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر — کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۱)

خالی بس اسی کو بزم یاراں سمجھو — یاروں کے جو کچھ ہیں داغ دل پر باقی

راقم الحروف کے لڑکپن میں سالک کے اس مطلع کی لکھنؤ میں بہت شہرت تھی۔

زباں کٹ جائے گر لب سے تمہارا کچھ گلہ نکلے — مگر یہ تو کہو ں گا ہم کو کیا سمجھے تھے کیا نکلے

پھر اپنی غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

دنیا میں مجھے خاک اُڑانے نے ڈبویا ہر بار نکل آتا ہے دریا مرے آگے

اسی شعر پر فرمایا خوب کہا ہے۔ یہ کہہ کر فرمانے لگے۔ لکھنؤ والے رد کے ہے کہتے ہیں کھینچے ہے نہیں بولتے اور ڈبویا بھی ان کی زبان پر نہیں میں لکھ جاتا ہوں۔

غالب مرزا غالب ۱۸۳۰ء میں لکھنؤ میں تشریف لائے یہ زمانہ نصیر الدین حیدر بادشاہ دوم اودھ کا تھا اس وقت تک میر انیس کی کافی شہرت لکھنؤ میں نہیں تھی وہ میر ضمیر اور شیخ ناسخ سے لکھنؤ میں ملے، لیکن انیس سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ میر صاحب کا ایک مشہور شعر ہے ؎

ہے سہل ممتنع یہ کلام ادق مرا برسوں پڑھے تو یاد نہ ہووے سبق مرا

غالب نے اس شعر پر اعتراض[1] کیا کہ کلام ادق سہل ممتنع کا منافی ہے پھر یاد نہ ہونا اور حافظہ پر نہ چڑھنا ہرگز سہل ممتنع کی صفت نہیں ہو سکتی۔ کلام ادق کلام مغلق کو کہتے ہیں۔ کلام مغلق اور کلام سہل ممتنع ضد یک دیگر ہیں ایک انصاف پسند دبیریے[2] نے اس اعتراض کا نہایت معقول جواب دیا ہے وہ فرماتے ہیں صاحب کی مراد اس موقع پر کلام ادق سے کلام مغلق نہیں ہے بلکہ ادق کے

---

[1] عود ہندی۔ رقعہ نمبر ۱۲۷۔ خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام۔

"یہ مصرعہ حیرت آور ہے کلام ادق سہل ممتنع کے منافی ہے پھر یاد نہ ہونا اور حافظہ پر نہ چڑھ جانا ہرگز سہل ممتنع کی صفت نہیں ہو سکتی۔ کلام ادق جس کا حفظ دشوار ہو شاید کوئی قسم اقسام کلام سے ہے ہاں کلام ادق کلام مغلق کو کہتے ہیں بس کلام مغلق اور کلام سہل ممتنع ضد یکدیگر ہے۔ مغلق اور ادق سہل ممتنع اور سہل ممتنع مغلق اور ادق کیونکر ہو سکے گا اور حافظہ میں محفوظ رہنا کلام ادق اور مغلق کی صفت کیونکر پائے گی۔ ہاں مغلق عسیر الفہم ہوگا۔ پڑھا نہ جائے گا معنی سمجھ میں نہ آئیں گے سہل ممتنع کی وہ صفت تھی جو فقیر اوپر لکھ آیا۔ اس شعر سے مجھ کو کچھ علاقہ نہیں۔

[2] سید افضل حسین ثابت لکھنوی

لغوی معنی لیجئے "بہت باریک کلام" مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرا کلام جس میں نازک خیالیاں ہیں باایں ہمہ سہل ممتنع ہے۔ دقیق کلام کی یہ صفت ہے کہ غور و فکر کے بعد سمجھ میں آئے۔ جن صاحبوں نے علم معانی و بیان کی کتابوں کی سیر فرمائی ہے اُن سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ جو کلام غور و فکر کے بعد سمجھ میں آتا ہے زیادہ لطف دیتا ہے اس کی مثال یہ لکھی ہے کہ جو نعمت و دولت کوشش و محنت سے آدمی کو ملتی ہے اس سے زیادہ مزہ آتا ہے۔ پس جس کلام میں نازک خیالات نظم ہوں اور آدمی محنت کر کے ان کے معنی حاصل کرے اس سے دماغ کو راحت اور روح کو فرحت زیادہ ہوگی۔ دوسرے مصرعہ میں "برسوں پڑھے آنج" کا مطلب یہ ہو کہ اگر کوئی شاعر میرے طرز خاص میں محنت کر کے برسوں کہے جب بھی میرا طرز تصنیف اسکو آ نہیں سکتا یہ بھی شاعر کا ایک کمال سمجھا جاتا ہے کہ اس کے طرز میں کہنے سے لوگ عاجز ہوں"

غالب کا مسدس ایک بار غالب نے بھی تین بند مرثیہ کے کہے وہ اس کوچہ سے ناآشنا تھے اور اس صنف سخن کو فصحائے لکھنؤ کمال تک پہونچا چکے تھے۔ تاہم تبرک غالب سے سنیئے :-

ہاں اے نفس باد سحر شعلہ فشاں ہو — اے دجلہ خوں چشم ملائک سے رواں ہو
اے زمزمہ قم لب عیسیٰ پہ فغاں ہو — اے ماتمیان شہ مظلوم کہاں ہو

بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تاب سخن و طاقت غوغا نہیں ہم کو — ماتم میں شہ دیں کے ہیں سودا نہیں ہمکو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو — گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہمکو
یہ خرگہ نہ پایہ جو مدت سے بپا ہے — کیا خیمہ شبیرؑ سے رتبہ میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے یہاں کا | کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا | ہوگا دلِ بیتاب کسی سوختہ جاں کا

اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رو سے کہ وہ برق نہیں ہے

تعداد مراثی

میر انیس کے مرثیوں کی تعداد کوئی نہیں بتا سکتا مؤلف حیات انیس دس ہزار تحریر فرماتے ہیں لیکن واقعات انیس کے مؤلف جن کو خاندان انیس سے قرابت کا بھی شرف حاصل ہے۔ فرماتے ہیں کہ مرثیوں کی تعداد ایک ہزار تک ہے کہتے ہیں کہ میر سلامت علی لکھنؤ میں ایک بزرگ تھے جن کو کلیات انیس جمع کرنے کا شوق تھا۔ انھوں نے میر صاحب کا وہ کلام بہم پہنچایا جو خود میر صاحب کے پاس بھی نہ تھا۔ ایک روز ان سے میر صاحب نے مسکرا کر دریافت کیا "کیوں صاحب میرا کلیات سب آپ نے جمع کر لیا ہوگا" میر سلامت علی نے عرض کی کہ حتی الامکان میں نے کوشش بلیغ کی ہے۔ میر انیس نے فرمایا "بھلا جناب عون و محمد کے حال کے کتنے مرثیے آپ کے پاس ہیں" میر سلامت علی صاحب نے مطلعے پڑھنا شروع کئے دس پندرہ مطلعوں کے بعد میر انیس نے فرمایا کہ اچھا اب آپ خاموش رہیں میں مطلع پڑھتا ہوں آپ اقرار کرتے جائیے۔ میر انیس نے مطلعے پڑھنا شروع کر دیے۔ اور میر سلامت علی حیرت سے منہ دیکھتے رہ گئے وہ کہتے جاتے تھے کہ یہ مرثیے میرے پاس نہیں ہیں آخر کار میر صاحب نے مسکرا کر فرمایا بس اسی تلاش پر تمھیں ناز ہے۔ بھائی کس پھیر میں پڑے ہو واللہ انیس کو خود معلوم نہیں کہ اسکی تصنیف کی حد کیا ہے مجھے گمان واثق ہے کہ فیض آباد سے لکھنؤ تک میری تصنیف میں عون و محمد کے مرثیے دو سو سے زیادہ

ہوں گے"۔ کثرت کلام کا اندازہ اس تاریخی شہادت سے ہو سکتا ہے کہ میر صاحب خود ایک سلام کے مقطع میں فرماتے ہیں:-

فیضِ غمِ حسین سے ہوتے ہیں اے انیسؔ   ہر سال ایک حال کے دفتر جدا جدا

بہت سے مرثیے ناتمام رہ گئے۔ ان کا اب کہیں پتہ نہیں۔ کلام چھ جلدوں میں شائع ہوا ہے لیکن ابھی تک سیکڑوں مکمل مرثیے باقی ہیں جو طبع نہیں ہوئے ان کے علاوہ بہت سے مرثیے اور سلام ایسے ہیں جن پر دوسروں نے تصرف کر لیا ہے میر مونسؔ اور میر نفیسؔ کے متعدد مرثیے میر انیسؔ کے کہے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

اندازِ ہنگامِ تصنیف میر صاحب خلوت خانہ میں تشریف لے جاتے اور اندر سے دروازے کی زنجیر بند کر لیتے وہاں بے تکلف ہو کر بیٹھتے اور دس دس بیس بیس پچاس پچاس بند کہہ ڈالتے جو ان کے لوحِ حافظہ پر لکھ جاتے جب باہر تشریف لاتے جو عزیز یا شاگرد سامنے آ جاتا اسے لکھا دیتے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ بستر پر دراز ہو جاتے چادر سر سے پاؤں تک اوڑھ کر منھ چادر کے اندر کر لیتے اور ایک ہاتھ خم کر کے اسکی کلائی آنکھوں پر رکھ لیتے اور شغلِ تصنیف جاری ہو جاتا تھا اس صورت میں بھی کاتب کوئی دوسرا شخص ہوتا تھا۔

میر مونس میر مونسؔ میر صاحب کے چھوٹے بھائی اور شاگرد تھے ایک مرتبہ ان کی زبان سے نکلا کہ مشاقوں کے نزدیک ایک شب میں سو پچاس بند مرثیہ کے کہہ لینا کچھ بڑی بات نہیں۔ غمازوں نے یہ فقرہ میر انیسؔ کے کان تک پہونچا دیا اور خدا جانے کس عنوان سے بیان کیا کہ میر صاحب کو چھوٹے بھائی کی طرف سے کسی قدر ملال پیدا ہوا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں

میر مونس نے ایک مجلس کے لئے نیا مرثیہ کہا اور میر صاحب کی خدمت میں بغرض اصلاح حاضر ہوئے۔ اس وقت میر صاحب دیوان خانہ کے حوض میں غسل فرما رہے تھے۔ گرمی کی فصل تھی اور ارادت مندوں کا مجمع تھا اور میر مونس تسلیم کر کے بیٹھ گئے۔ میر صاحب نے فرمایا اسوقت کہاں آئے۔ عرض کی کہ مجلس کا زمانہ قریب ہے اصلاح کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ میر صاحب مسکرائے اور فرمایا اچھا تم مرثیہ پڑھو میں سنتا ہوں۔ میر مونس نے مرثیہ شروع کیا۔ میر انیس غسل کرتے جاتے تھے اور کلائیوں کو مل رہے تھے معلوم ہوتا تھا کسی گہرے خیال میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ پچیس تیس بند سُننے کے بعد فرمایا "لاؤ مرثیہ مجھے دیدو" میر مونس نے ہاتھ بڑھا کر مرثیہ دیدیا۔ میر صاحب نے مرثیہ کو دو تین مرتبہ حوض میں غوطہ دیکر اسی کے اندر چھوڑ دیا اور فرمایا کہ اس مرثیہ میں کیا ہے جسے اتنی بڑی مجلس میں پڑھنے کا ارادہ کیا ہے۔ یہ کہہ کر حوض سے باہر تشریف لائے اور زنانے مکان میں چلے گئے۔ میر مونس سکتے میں بیٹھے رہ گئے کچھ تصنیف کے ضائع ہونے کا ملال اور کچھ بھائی کی ملامت کا اثر غرض عجب مخمصہ تھا کہ قابل بیان نہیں۔ تھوڑی دیر بعد میر صاحب نے بھائی کو بلا بھیجا۔ میر مونس مکان میں تشریف لے گئے دستر خوان بچھا ہوا تھا۔ میر صاحب بھائی کا انتظار کر رہے تھے۔ میر مونس سے فرمایا میں جانتا ہوں مرثیہ کا غم تمھیں بہت ہے مگر خیر آؤ کھانا تو کھا لو۔ میر مونس تعمیل حکم میں مصروف ہوئے۔ میر صاحب مسکراتے جاتے اور مونس سے باتیں کرجاتے تھے اثنائے گفتگو میں فرمایا بھائی اتنا غم کیوں کرتے ہو۔ ماشاءاللہ جوان آدمی ہو کیا بڑی بات ہے مجلس کو کئی روز باقی ہیں۔ دوسرا مرثیہ کہہ لو۔ میر مونس نے عرض کی حضور خوب جانتے ہیں مجھ میں اس قدر قوت شاعری نہیں ہے۔ میر انیس نے

فرمایا پھر کس بھر دے پر کہا تھا کہ سو پچاس بند ایک رات میں کہہ لینا بڑی بات نہیں۔ میر مونس کو اپنا قول یاد آیا نہایت محجوب ہوئے۔ کھانے سے فراغت کے بعد میر انیس پلنگ پر تشریف لے گئے ایک بھائی اور دو فرزندوں کو حکم ہوا کہ پلنگ کے قریب کرسیوں پر بیٹھیں کاغذ ہر ایک کے ہاتھ میں دیا گیا اور سلسلۂ تصنیف شروع ہوا اُس کا مطلع ہے۔

مجلس افروز ہے مذکورِ وفاداریٔ حرؑ

یہ مرصع مرثیہ اب میر مونس کے نام سے مشہور ہے ایک بند سننے کے قابل ہے حرؑ شبِ عاشورہ کو طلوعِ سحر کا منتظر ہے۔ خیریت سے صبح ہو تو وہ حضرت امام کے حضور میں جائے۔

متردد و متفکر متحیّر بے چین | تھی دعا دل میں بچے فاطمہ کا نورِ عین
تھرتھراتا تھا سیدانیاں کرتی تھیں جو بین | طپش دل کا تقاضا تھا کہ چل سوئے حسینؑ

صبح اعدا میں نہ شاہِ شہدا گھر جائیں
شب کو مل جائے جو خورشید تو دن پھر جائیں

انیس نفیس و مونس | ایک مرتبہ میر انیس سے کسی صاحب نے عرض کی کہ آپ کے خاندان میں سب صاحبوں نے اپنے اپنے مذاق کے موافق مرثیے کہے ہیں اگر ایک مضمون پر ایک ہی بحر میں تین مرثیے لکھے جائیں تو بڑی دلچسپی سے سُنے جائیں گے۔ چنانچہ وہی یہ بات طے ہو گئی کہ حضرت زینب کے بیٹوں کی جنگ کو مع تشبیب صبح ایک ہی بحر میں لکھا جائے اور چند لوازم جمع کیے جائیں اس پر میر نفیس نے یہ مرثیہ لکھا ؎

جب عابدوں کو طاعتِ رب میں سحر ہوئی | تیاریٔ نمازِ جماعت اُدھر ہوئی

اور میر مونس نے اس مرثیہ میں اپنی طاقت شاعری صرف کی ؎

جب آسماں پہ پھر کا زریں نشاں کھلا
پھولی شفق در چمن آسماں کھلا

اور میر انیس نے یہ مرثیہ کہا :۔

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے

آخری مرثیہ یہ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا سب سے آخری مرثیہ کون ہے مگر حسب ذیل مرثیہ یقیناً آخری زمانہ کا کلام ہے اگرچہ ممکن ہے کہ وہ سب سے آخری نہ ہو۔ مطلع :۔

واحسرتا کہ عہد جوانی گذر گیا ہنگام قوت ہمہ دانی گذر گیا
وہ زور شور سحر بیانی گذر گیا اب کیا علاج فرق سے پانی گذر گیا
پھولا ہے باغ بزم میں شیعہ بہم نہیں
افسوس مجلسیں تو وہی ہیں پہ ہم نہیں

میر صاحب کا مشہور مرثیہ ع جب آسماں پہ ختم ہوا دور جام شب۔ بھی عہد پیری کا کلام ہے۔ مقطع میں فرماتے ہیں۔

بس اے انیس ضعف سے لرزاں ہے بند بند عالم میں یادگار رہیں گے یہ چند بند
ٹپکے قلم سے ضعف میں کیا کیا بلند بند عالم پسند نقطے ہیں سلطاں پسند بند
یہ فصل اور بزم عزا یادگار ہے
پیری کی طاقتیں ہیں خزاں کی بہار ہے

آخری مجلس مولانا اشہری نے لکھا ہے کہ میر صاحب نے آخری مجلس شش محل واقع لکھنؤ میں پڑھی اور اس مجلس میں جو مرثیہ آخری مرتبہ پڑھا وہ یہ تھا۔ مصرعہ

آتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج

لیکن مؤلف واقعات انیس لکھتے ہیں کہ میر صاحب نے آخری مجلس شیخ

علی عباس وکیل کے مکان میں پڑھی تھی اور اس کے بعد کہیں نہیں پڑھے اور یہی روایت غالباً زیادہ صحیح ہے۔

مرض الموت | ۲۴ ر رمضان ۱۲۹۱ھ کو میر صاحب تپ اور دردِ سر میں مبتلا ہوئے اس کے پیشتر ان کو سوائے ضعفِ پیری اور کسی مرض کی شکایت نہ تھی۔ تپ رفتہ رفتہ بڑھ گئی اور چند روز کے بعد ورمِ جگر کی شکایت لاحق ہوئی۔ لکھنؤ کے مشہور اطبا کا علاج جاری رہا مگر بقول اُستاد۔

ضعف از حبّ جواہر می فزود | ہر دوا در کار نو دبے کار بود

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر میں اسہال کبدی اور دق کی شکایت ہوگئی۔ بستر مرگ پر میر صاحب نے سخن آخریں کا خاتمہ کر دیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

رباعی

یہ چند نفس حیات کیونکر گذرے | دردِ والمِ ممات کیونکر گذرے
اب دیکھیں لحد کی رات کیونکر گذرے | پیری کی بھی دوپہر ڈھلی شکر نہیں

رباعی

کشتی وہ ہوئی غرق وہ بیڑا نہ رہا | وہ موجِ حوادث کا تھپیڑا نہ رہا
جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا | سارے جھگڑے تھے زندگانی کے انیسؔ

رباعی

رخصت اے زندگی کہ مرتا ہوں میں | آخر ہے حیات کوچ کرتا ہوں میں
اوپر کے دم اسواسطے بھرتا ہوں میں | اللہ سے لَو لگی ہوئی ہے میری

شعر

پیمانہ بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے | آخر ہوئی عمرِ زیست سے اب دل بھی سیر ہے

وفات | ۲۹ ر ذیقعدہ روز دوشنبہ قریب مغرب انتقال فرمایا۔ جناب غفرانمآب کے

امام باڑہ میں قبلہ وکعبہ سید بندہ حسین نے نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے باغ واقع سبزی منڈی میں دفن ہوئے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے ان کے قدر شناس وحریف مقابل مرزا سلامت علی دبیر نے ایک دردناک تاریخ[۱] میر باقر کے امام باڑہ کی مجلس میں پڑھی۔ چشم دید شہادت ہے کہ مرزا صاحب تاریخ کے اشعار پڑھتے جاتے اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ

---

۱ مرزا دبیر کا تاریخی مصرعہ "طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس" لکھنؤ میں بہت مشہور ہے۔ انیسیوں کو اعتراض ہے کہ اس مصرعہ سے ۱۲۹۱ھ نہیں نکلتے اور وجہ شبہ کی یہ ہے کہ اس مصرعہ میں بعض کلمات کے اعداد بطور زبر اور بعض کے بطور بینہ لئے جائیں تب سنہ مقصود حاصل ہوتا ہے یعنی "طور سینا" کے اعداد بطور زبر بینہ لئے جائیں اور "بے کلیم اللہ و" کے بطور زبر "منبر بے" بطور زبر بینہ اور "انیس" کے بطور زبر تو ۱۲۹۱ھ حاصل ہوجاتے ہیں۔ دیکھیے:-

(طور سینا) بقاعدہ زبر وبینہ (بے کلیم اللہ و) بقاعدہ زبر (منبر بے) بقاعدہ زبر وبینہ (انیس) بقاعدہ زبر۔

طا	۱۰	بے	۱۲	* میم	۹	الف	۱
واو	۱۳	کلیم	۱۰۰	نون	۱۰۶	نون	۵۰
را	۲۶	اللہ	۶۶	یا	۳	ی	۱۰
سین	۱۲۰	و	۶	را	۳۱	س	۶۰
یا	۱۱		۱۸۴	با	۳		۱۲۱
نون	۱۰۶			یا	۱۱		
الف	۱۱				۴۱۴		
	۵۷۲						

۵۷۲ + ۱۸۴ + ۴۱۴ + ۱۲۱ = ۱۲۹۱ھ

لیکن اس بحث کی ضرورت باقی نہیں رہتی جب مرزا دبیر کی تاریخ پڑھی جائے کیونکہ آخری دو اشعار میں انھوں نے خود ہی لکھ دیا ہے کہ انیس کے غم میں طبیعت مکدر رہی اس لئے تاریخ ہجری صاف صاف نہیں نکلی۔ اسی مصرعہ پر ایک اور مصرعہ ضم کرکے انھوں نے سنہ عیسوی بے کم وکاست حاصل کیا یعنی ذیل کے پورے شعر سے ۱۸۷۴ء نکلتے ہیں۔ شعر

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

گر رہے تھے اس تاریخ کے چند شعر یہاں لکھے جاتے ہیں۔

قطعۂ تاریخ

داد خواہم یا غیاث المستغیثین الغیاث — از کہ دل مانوس گردوے سخنور بے انیس

عبرۃً للناظرین گردید افلاک و زمیں — دیدنی بنود مہ و خورشید و اختر بے انیس

وا دریغا عیسیٰ نہ دیں دو یا زیم شکست — بے نظیر اول شدم امسال آخر بے انیس

یادگار رفتگاں ہستیم و مہمانِ جہاں — چند روزہ چند ہفتہ بے برادر بے انیس

الوداع اے ذوق تصنیف الفراق اے شوقِ نظم — شد جدا از خمسہ ددہ عقل ششدر بے انیس

اشک ہا را بطے بدامن بود لیکن اشک ما — رفتہ رفتہ رفت تا دامانِ محشر بے انیس

تازہ مضموں نظم می فرمود در ہر بحر شعر — چشمۂ چشمم شود ہم چشم کوثر بے انیس

سال تاریخش بزد بر و بینہ شد زیب نظم — طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

در سنینِ عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف — گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامیں

طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

میر انیس کی شاعری میر صاحب کی آغاز شہرت سے پہلے "مرثیہ گوئی" درجۂ کمال کو پہونچ چکی تھی۔ قدیم روش ترک ہو کر میر ضمیر کا طرز جدید مقبول ہو چکا تھا۔ چہرہ باندھا جاتا تھا۔ سراپا میں زور طبیعت صرف ہوتا تھا اور رزمیہ مضامین نظم کئے جاتے تھے۔ مرزا دبیر نے شوکت الفاظ اور مضمون آفرینی کے طلسمات سے اس زمین کو آسمان بنا دیا تھا اور عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ ضمیر اور دبیر نے اس صنف سخن میں ترقی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رکھی۔

دار السلطنت اس وقت تکلف اور تصنع پر مٹا ہوا تھا۔ رعایت لفظی اور

---

(۱) مرزا غلام محمد نظیر حضرت دبیر کے بڑے بھائی تھے ۲۵ صفر ۱۲۹۱ھ کو راہی ملک بقا ہوئے۔

دوراز کار صنعتوں کی گرم بازاری تھی۔ مرزا بیدل کی معنی آفرینی مرغوب طبائع تھی اور سخن سنج نظم اُردو میں وہ صنائع تلاش کرتے جن کی مثالوں سے اعجاز خسروی کا دفتر رنگین ہے۔ مرزا دبیر نے اپنی بذلہ سنجی اور بلند پروازی سے مرثیوں کو صنائع و بدائع سے مالا مال کر رکھا تھا اور لکھنؤ کے بازار میں اسی جنس کی اس وقت مانگ تھی۔

میر خلیق ایک وقت میں میر ضمیر کے حریف مقابل تھے لیکن ان کا طرۂ امتیاز محاورہ بندی اور روزمرہ کی صفائی تھا۔ اور یہ سکہ اب شہر میں کھوٹا سمجھا جاتا تھا۔ وہاں تو نزاکت لفظی اور خیال آفرینی کی تلاش تھی جتنے کہ ایک ظریف کے قول کے مطابق بھوک پیاس کی تسکین کے لئے آنسو پینے[1] اور قسمیں کھانے کی ضرورت ہوتی تھی۔

میر انیس نے سلاست زبان۔ صفائی روزمرہ اور خوبی بندش کی نعمتیں ورثے میں پائی تھیں لیکن اس "بدمذاقی" کے زمانے میں یہ اوصاف بقائے دوام کے دربار میں جگہ دلانے کو کافی نہ تھے۔ غور کرنا چاہیئے کہ کلام انیس میں وہ کیا خاص وصف تھا جس نے ان کی شاعری کو دوسرے اساتذہ کے کلام سے ممتاز بنایا اور ان کے مرثیوں کو قبول عام کی سرکار سے غیر فانی کا خطاب دلایا؟

میر صاحب اور ان کے باکمال ہمعصروں کے سو سو پچاس مرثیے پڑھے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قسام ازل نے میر صاحب کی فطرت میں ایک خاص جوہر ودیعت کر رکھا تھا۔ جو دوسرے شعراء کے یہاں کمیاب ہے اور اسی نعمت کے مناسب اور بجا استعمال نے انیس کو مجلس کمال کا صدر نشین بنایا۔ اس جوہر کا مختصر نام "مصوری" یا "واقعہ نگاری" جس کو لکھنؤ کے

[1] نسیم۔ کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں :. آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں

عوام ان الفاظ سے تعبیر کرتے تھے کہ "حفظ مراتب جیسا ان کے کلام میں ہوتا ہے وہ انھیں کے ساتھ مخصوص ہے" یعنی "موقع ہو جہاں جیسکی عبارت ہوے"

انگلستان کے ایک فلاسفر کا قول ہے کہ شاعری فطرت کی پوشیدہ دلچسپیوں کے چہرہ سے نقاب اٹھا دیتی ہی اور اُس کے اثر سے ہم کو مانوس چیزیں انوکھی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ میر صاحب جس حالت کیا جذبہ کو بیان کرتے اُس کی تصویر کھینچ دیتے اور بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں جن پر معمولی شاعر کی نظر نہیں پہونچتی وہ بغور و تعمق دیکھ لیتے اور اُنکا اظہار ایسی سادہ زبان اور مناسب الفاظ میں کرتے کہ کلام انوکھا معلوم ہوتا تھا اور سہل ممتنع کا خطاب پاتا تھا۔

تصویر کشی کا کمال یہ ہے کہ نقشہ اصل کے مطابق ہو۔ لیکن میر صاحب کی کھینچی ہوئی تصویر اصل سے بہتر ہو جاتی تھی مثلاً شبنم کے قطرے دیکھکر انسان کے جذبات پر وہ اثر نہیں پڑ سکتا جو اس تصویر سے پڑتا ہے۔

تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا   کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

یا کسی کہن سال شجاع کو دیکھکر وہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی جو اس بند سے ہوتی ہے

رومال پھاڑ کر انھیں باندھا تھا استوار   ابرو جھکے جو پڑتے تھے آنکھوں پہ بار بار[1]
گویا کہ تھی خلاف میں حیدر کی ذوالفقار   آنکھوں سے شیر نر کی جلالت تھی آشکار

جلدی چلے جو چند قدم جھوم جھوم کے
رعشہ وداع ہو گیا ہاتھوں کو چوم کے

میر صاحب ایسے نازک معاملات تلاش کر کے لاتے جن کی طرف معمولاً نظر بھی نہیں پہونچ سکتی۔ اور پھر ان کو اس طرح بیان کرتے کہ اُن کا کلام

---

[1] جناب حبیب ابن مظاہر بہت بوڑھے اور حضرت امام حسین کے رکاب میں پیدل تھے۔

سب جانفشاں سوار تھے راہ ثواب میں   پیدل مگر تھے ابن مظاہر رکاب میں

بالکل مقتضائے فطرت کے موافق معلوم ہوتا ہے اگر بہت سے آدمی ایک جگہ پر لاٹھیاں یا علم لئے کھڑے ہوں تو دُور سے دیکھنے والوں کو ان پر درختوں کے شبہہ ہوتا ہے اس نیچرل واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں :۔

(حضرت امام حسین سفر میں ہیں اور حرُ کا دستہ راستہ روکنے کو آتا ہے)

حضرت بھی چلے جاتے ہیں افسردہ و دلگیر جو ایک دلاور نے کہی گھوڑے پہ تکبیر
اس شخص سے فرمانے لگے حضرت شبیرؑ بتلا سبب اس ذکر کا اے صاحب توقیر
کی عرض قریب آگئے شہ عرش نشیں کے
وہ نخل نظر آتے ہیں کوفہ کی زمیں کے

اوروں نے کی عرض کہ اے دلبر زہرا خرمے کے یہاں نخل تو دیکھے نہیں اصلا
عباس علمدار نے جب غور سے دیکھا کی عرض شہ دیں سے کہ فوج آتی ہے مولا
کیا جانیے انبوہ ہے یا چند نفس ہیں
نوکیں یہ سنانوں کی ہیں یا گوش فرس ہیں

ہنستی ہوئی آنکھ کی تعریف سب شعرا نے کی ہے لیکن روتی ہوئی آنکھ کی آنکھ کی تصویر کھینچنا میر صاحب کا حصہ تھا :۔

(سراپائے حضرت علی اکبرؑ)

روئے ہیں فرقت شہ عالی جناب میں نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں

یہی نرگس کے پھول ایک اور موقع پر قیامت برپا کر دیتے ہیں حضرت قاسمؑ اپنی ایک شب کی بیاہی دُلھن سے رخصت ہوتے ہیں اور ان کو رونے سے منع کرتے ہیں۔

آنکھوں پہ ہیں ہتیلیاں رقت کا ہے وفور نرگس کے پھول ہاتھوں سے ملنا یہ کیا ضرور

اسی مرثیہ میں جب حضرت قاسم کو دُلھن سے بات چیت میں دیر لگی ہے

اور میدان سے مبارز طلبی کی صدا آتی ہے۔ حضرت قاسم کی ماں ایک انوکھے طرز سے اپنے صاحبزادہ کو میدان میں جانے کی تاکید کرتی ہیں۔

ماں نے کیا اشارہ کہ اے میرے گلعذار موقع نہیں ہے دیر کا اٹھو یہ ماں نثار

کیا جانے ہو گا قبر میں کیا حال باپ کا
جی لگ گیا عروس کی باتوں میں آپ کا

حضرت زین العابدین طوق و زنجیر سے مسلسل کربلا سے روانہ ہوتے ہیں ان کی تصویر ایسے دردناک الفاظ میں کھینچی کہ کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔

تلواریں لئے چاروں طرف ظلم کے بانی حلقے میں دل آزاروں کے وہ یوسف ثانی
غربت۔ الم بے پدری۔ تشنہ دہانی وہ طوق کا لنگر وہ سلاسل کی گرانی

مڑ کر کبھی زینب کے رخِ پاک کو دیکھا
بیڑی کبھی دیکھی کبھی افلاک کو دیکھا

حضرت علی اکبر جنگ کے لئے اجازت طلب کرتے ہیں حضرت شہربانو فرماتی ہیں کہ اگر آج میں اپنے بیٹے کو لڑنے کی اجازت نہ دوں تو "اشراف بیبیاں" یہ طعنہ دیں گی کہ:۔

گھر فاطمہ کا اس کی بہو نے ڈبو دیا فرزند کو بچا لیا وارث کو کھو دیا

امام حسین علیہ السلام فاطمہ صغرا کو بوجہ شدت مرض کے مدینہ میں چھوڑنا چاہتے ہیں اور کوئی عزیز۔ بیمار کی سفارش نہیں کرتا تو فرماتی ہیں۔

حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اس کا
وہ آنکھ چرا لیتا ہے منہ تکتی ہوں جس کا

امام حسین حضرت اصغر کو خیمہ سے لیکر نکلتے ہیں۔

نکلا تھا نہ وہ گھر سے کبھی ہنسلیوں والا داماں عبا چہرۂ فرزند پہ ڈالا

روتا تھا تو چھاتی سے لگا لیتے تھے شبیرؑ ہر گام پہ دامن سے ہوا دیتے تھے شبیرؑ

حضرت علی اکبر نے ماں سے اجازت لیکر میدان جنگ میں تشریف لے جانے کا قصد کیا ہے۔ حضرت امام علیہ السلام نے فرمایا کہ پھوپھی سے بھی اجازت لو اس وقت حضرت زینب فرماتی ہیں:۔

زینب نے کہا جس میں رضائے شہ عالی میں نے تو کوئی بات نہیں منہ سے نکالی
کیا غم ہے نہ پوچھا مجھے ماں سے تو رضا لی مالک ہیں وہی میں تو ہوں اک چاہنے والی

صدقے گئے فرزند پھوپھی سوگ نشیں ہے
سمجھیں تو مرا حق ہے نہ سمجھیں تو نہیں ہے

بچپن میں یہ کاہے کو مری چھاتی پہ سوئے کب جاگی میں تا صبح جو یہ چونک کے روئے
کنگھی نہیں کی گیسوئے مشکیں نہیں دھوئے ان کے لئے کب میں نے بسر ہاتھ سے کھوئے

کیوں سوتے ہیں یہ کس لئے حضرت کو قلق ہے
حقدار میں کاہے کا مرا کون سا حق ہے

یزید کی بیوی ہند اہل حرم کی زیارت کے لئے قید خانہ میں جانا چاہتی ہے تو کنیزیں لطائف الحیل سے مانع آتی ہیں۔

بڑھ کر کسی کنیز نے تب یہ کیا بیاں بی بی کوئی اسیروں میں زندہ نہیں ہے یاں
چلئے محل میں آپ بھلا جائیں گی کہاں قابل نہیں حضور کے جانے کے یہ مکاں

گر غش ہوئے تو آپ میں آیا نہ جائے گا
ہم سے تو اس خرابہ میں جایا نہ جائے گا

جناب امام علیہ السلام کے تمام اعزہ و اقربا شہید ہو چکے اس وقت ایک راہ رو اُدھر سے گذرتا ہے اور یہ عبرت انگیز سماں دیکھ کر امام علیہ السلام سے واقعہ کی کیفیت دریافت کرتا ہے۔ جناب داستان مظلومی سُناتے ہیں۔

لیکن اپنا اسم مبارک ظاہر نہیں فرماتے وہ اظہار اسم اقدس واعلیٰ پر اصرار کرتا ہے تو حضرت کا جواب اس طرح نظم فرماتے ہیں۔

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

اہل بیت کا یزید کے دربار میں تباہ و خستہ حاضر ہونا۔ واقعہ کربلا کا ایک نہایت دردناک اور عبرتناک ٹکڑا ہے۔ اس موقع پر مظلوموں کی بیکسی اور حاکم وقت کے کفر و نفاق کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی جاتی ہے:۔

تخت کے سامنے روتے ہوئے آئے جو اسیر   دیکھ کر سید سجاد کو بولا وہ شریر
سرکشی کر کے نہ سر بر ہوئے مجھ سے شبیر   شکر کرتا ہوں کہ خالق نے کیا تمکو حقیر
بیٹھنے کا کوئی دنیا میں سہارا نہ رہا
پنجتن اٹھ گئے اب زور تمھارا نہ رہا

ہاں کہو آج حمایت کو پیمبر ہیں کہاں   کیا ہوئے ابن علی۔ حیدر صفدر ہیں کہاں
قید میں انکی بہو آئی ہے شبر ہیں کہاں   ننگے سر زینب دلگیر ہے سرور ہیں کہاں
ذبح خنجر سے ہوا جو وہ پدر کس کا ہے
اک ذرا غور سے دیکھو تو یہ سر کس کا ہے

شبنم اور سبزہ کی تصویر کا ایک رُخ پہلے دکھایا ہے دوسرے موقع پر وہی اُداس عجب آفت ڈھاتی ہے۔

چلتی تھی تیز و تند ہوا اُڑ رہی تھی گرد   گلشن میں پھر رہی تھی صبا دل سے آہ سرد
رنج والم سے رنگ گُل ارغواں تھا زرد   چٹکی اگر کلی بھی تو آئی صدائے درد
نرگس تھی غم سے ششدر و حیراں کھڑی ہوئی
سبزہ نڈھال اوس گلوں پر پڑی ہوئی

حضرت کے چہرۂ پاک پر عرق اس قدر آ گیا تھا کہ اسکی بوندیں زمیں پر ٹپکتی تھیں۔ لہذا ارشاد ہوتا ہے۔

کثرت عرق کے قطروں کی تھی روئے پاک پر
موتی برستے جاتے تھے مقتل کی خاک پر

امام حسین علیہ السلام میدان جنگ میں بھی رحمت و شفقت ترک نہیں فرماتے۔

لڑتے تھے مگر غیظ سے رحمت تھی زیادہ　　شفقت بھی نہ کم تھی جو شجاعت تھی زیادہ
نانا کی طرح خاطر امت تھی زیادہ　　بیٹوں سے غلاموں کی محبت تھی زیادہ
تلوار نہ ماری جسے منھ موڑتے دیکھا
آنسو نکل آئے جسے دم توڑتے دیکھا

عاشورہ کی حسرت ناک صبح ہے اور رفقاء امام علیہ السلام نماز میں مصروف ہوتے ہیں۔

نکلے حرم سے کرکے تیمم امام پاک　　سجادے سب نے لاکے بچھائے برروئے خاک
اکبر نے دی اذاں جو بآواز دردناک　　آنسو بھر آئے ہوگئے غم دل سے چاک چاک
آگے سبھوں کے شاہ حجازی کھڑے ہوئے
پیچھے صفیں جماکے نمازی کھڑے ہوئے

آراستہ صفیں تھیں کہ قرآں کھلا ہوا　　بسم اللہ آگے جیسے ہو یوں تھا وہ مقتدا
اور مقتدی تھے سب عقب شاہ کربلا　　مصحف کی جس طرح سے ہوں سطریں جدا جدا
جیسا امام ویسی ہی ابرار فوج تھی
ہر صف خدا کے نور کے دریا کی موج تھی

سیدھے کبھی الف کی طرح تھے وہ خوشخصال　　جھک جاتے تھے رکوع میں گاہے بشکل دال
خم ہوگئے سجود میں گہ صورت ہلال　　پیشانیوں سے صاف عیاں نور ذوالجلال

حق سے دعا قنوت میں کوثر کے جام کی
طاعت خدا کی تھی تو اطاعت امام کی

وہ چاند سے سفید عمامے رخوں پہ نور — دیکھے سے جن کے سیر کبھی ہو نہ چشم حور
دیندار و حق پرست و دل آگاہ و با شعور — کمریں کسے جہاد پہ راحت دلوں سے دور
لب پر درود اشکوں سے آنکھیں بھری ہوئی
تلواریں سجدہ گاہوں کے آگے دھری ہوئی

حضرت امام کے جلوس سواری کی تصویر ایک بند میں اسطرح بیان ہوتی ہے:۔

جاتی تھی یوں سواری سلطانِ بحر و بر — انجم کی فوج لیکے چلے جس طرح قمر
کھولے علم کو حضرت عباس نامور — گھوڑوں پہ قاسم و علی اکبر ادھر ادھر
رکب پہ بیچ میں خلفِ بو تراب ہے
دو چودھویں کے چاند ہیں اک آفتاب ہے

حضرت زینبؑ کے صاجزادے شہید ہو چکے۔ اندیشہ ہے کہ اب حضرت علی اکبر میدان جنگ کے لئے اذن طلب کریں گے اس وقت حضرت قاسمؑ کی والدہ فرماتی ہیں:۔

اولاد اپنی آج کے دن گر بچاؤں گی
میں فاطمہ کو حشر میں کیا منھ دکھاؤں گی

حضرت علی اکبر پھوپھی سے جنگ کی اجازت طلب کرتے ہیں اور دفع دخل کے طور پر کہتے ہیں کہ باغ جوانی کوئی رائگاں نہیں کرتا اگر کوئی پھر گلشن جہاں سے چھوٹے تو وہ بھی افسوس کی بات ہے۔

لیکن جہاں سے آج گذرنا ہی خوب ہے — عزت پہ بات آئے تو مرنا ہی خوب ہے

حضرت علی اکبر کو سر کٹانے کی ماں نے اجازت دی تو جناب امامؑ

حضرت شہر بانو کے صبر و رضا کی تعریف کر کے ارشاد فرماتے ہیں:-

آفت تو ہے فرزند کا دنیا سے گذرنا
انسان کو لازم ہے مگر صبر بھی کرنا
برسوں سے یہی رنگ گلستانِ جہاں ہے
جس گل پہ بہار آج ہے کل اس پہ خزاں ہے
آرام جسے دیتے ہیں چھاتی پہ سُلا کر
رکھ آتے ہیں ہاتھوں سے اسے قبر میں جا کر
مٹی سے بچاتے ہیں سدا جس کا تنِ پاک
اُس گل پہ گرا دیتے ہیں بس سیکڑوں من خاک
اور جسے عریاں نہیں کرتی تہِ افلاک
وہ قبر میں سوتا ہے دھری رہتی ہے پوشاک
غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اُجالا نہیں ہوتا

حضرت علی اکبر شہید ہوئے تو جناب امام کے قلق و صدمہ کی تصویر ایسے الفاظ میں کھینچی ہے کہ جواب نہیں ہو سکتا۔

جب برچھی کھا کے گم ہوا اکبر سا نونہال
فرزند فاطمہ کا کہوں کس زباں سے حال
لرزہ تھا جسم پاک میں خورشید کی مثال
چلاتے تھے شہید ہوا ہائے میرا لال
تھامے ہوئے کلیجے کو گھبرائے پھرتے تھے
اک اک قدم پہ ٹھوکریں کھا کھا کے گرتے تھے

آنکھوں میں اشک لب پہ فغاں اور دل میں درد
ہاتھوں میں رعشہ چہرۂ اقدس کا رنگ زرد
صدمے سے ہاتھ پاؤں کبھی گرم گاہ سرد
شل کلائیاں خمیدہ کمر گیسوؤں پہ گرد
دیکھی جو کوئی لاش تو گھبرا کے گر پڑے
جلدی کبھی چلے کبھی غش کھا کے گر پڑے

حضرت عباس نہر کے پاس پہونچتے ہیں۔ کئی دن کا پیاسا گھوڑا پانی دیکھ کر بیتاب ہوتا ہے حضرت عباس اس کو پانی پینے سے روکتے ہیں۔ اس کشمکش کے موقع پر گھوڑے کی اضطرابی حالت یوں بیان ہوتی ہے:-

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند — دریا کو منہ نہ لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند — چمکارتے تھے حضرت عباس ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

رفقائے امام علیہ السلام صف نماز سے لڑائی کے لئے اٹھتے ہیں۔

تیار جان دینے پہ چھوٹے بڑے ہوئے — تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے

بالی سکینہ۔ فاقوں سے کمزور سکینہ دمشق کے قید خانہ کے دربانوں سے اپنا حال زار کہنے جاتی ہیں:۔

بولا نہ جب کوئی تو ہوا غم زیادہ تر — دیوار پکڑے پکڑے گئی وہ قریب در
پٹ کو ہلا ہلا کے پکاری وہ نوحہ گر — دربانو! جاگتے ہو کہ سوتے ہو بے خبر
بیکس ہوں تشنہ لب ہوں فلک کی ستائی ہوں
کچھ تم سے اپنا حال میں کہنے کو آئی ہوں

جب دربان بھی حضرت امام کا مفصل احوال نہیں بتلاتے اور خون میں ڈوبا ہوا خنجر دکھلاتے ہیں تو سکینہ اپنی ماں سے شکایت کرتی ہیں۔

کہتے ہیں باپ کو پوچھا تو تجھے ماریں گے — کیا میں بن باپ کی ہو گئی جو مجھے ماریں گے

اصغر شیر خوار کی لاش دفن کر کے حضرت امام زمین قبر سے خطاب کرتے ہیں۔

پہلے پہل چھٹا ہے یہ ماں کے کنارے سے — واقف نہیں ہے گور کی شب ہائے تار سے
اے قبر ہوشیار مرے گلعذار سے — گردن چھدی ہوئی ہے بچانا فشار سے
سید ہے لال حضرت خیر النسا کا ہے
معصوم ہے شہید ہے بندہ خدا کا ہے

ابتدائے زمانہ کی شکایت۔

ہر دم رہے انیسؔ زباں پر خدا خدا   بحر جہاں میں کون کسی کا ہے آشنا
دلداری و محبّت و دلجوئی و وفا   معدوم ہیں بصورت عنقا و کیمیا

گستاخ ہو کے عرض کیا ہے معاف ہو
ہم نے تو ایک دل بھی نہ پایا جو صاف ہو

حضرت مسلم کوفہ میں شہید ہوئے۔ ان کے بچوں کی تباہی اور اسیری کی داستان ایسے دردناک الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ واقعہ نگاری کا خاتمہ کر دیا۔ میر صاحب کا اصلی جوہر اسی قسم کے کلام میں ظاہر ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ سین کسی قدر تفصیل سے نقل کیا جاتا ہے۔ یہ اقتباس اُس مرثیہ سے ہے جس کا مطلع ہے :-

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں
راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں

یہ کلام میر صاحب کی متوسط عمر کا ہے۔

جب قتل ہوا ایلچی سید والا   بچوں پہ عجب حادثہ تقدیر نے ڈالا
کوئی نہ یتیموں کا رہا پوچھنے والا   ننھے ننھے سے سینوں میں کلیجے تہ و بالا

گیسو بھی پریشان تھے کرتے بھی پھٹے تھے
خورشید سے منہ گردیتیمی سے اٹے تھے

پردیس میں معصوموں کا دشمن تھا زمانہ   نہ بیٹھنے کی جا تھی نہ رہنے کا ٹھکانا
بن باپ کئی روز سے کھایا تھا نہ کھانا   تقدیر میں غم کھانا تھا یا اشک بہانا

سہمے ہوئے آپس میں یہی کہتے تھے رو کر
ساتھ آئے تھے افسوس چلے باپ کو کھو کر

پاس ان کے اگر ہوتے تو کچھ کام آتے   ہم بنتے نشانہ جو لعیں تیر لگاتے

پانی تو بھلا منھ میں دم مرگ چواتے — کاندھوں پہ پسر باپ کے لاشے کو اٹھاتے
کیا جانے مرنے پہ بھی کیا رنج و محن ہیں
گاڑے بھی گئے یا ابھی بے گور و کفن ہیں

مظلوم کی تربت کا پتا اب بھی جو پائیں — رخصت کیلئے قبر پہ روتے ہوئے جائیں
تعویذ مزارِ پدر آنکھوں سے لگائیں — سر پیٹ کے فریاد کریں اشک بہائیں
پالا تھا ہمیں باپ نے چھاتی پہ سُلا کر
قرآن بھی ہم پڑھ نہ سکے قبر پہ جا کر

اک ایک لعیں کوفہ میں دشمن ہے ہمارا — ایک دوست تھا ہانی سو وہ دنیا سے سدھارا
بیٹھیں کہیں چھپ کر نہیں اتنا بھی سہارا — غربت میں ہیں باپ کے مرجانے سے بارا
اک دم میں یقیں ہے کہ تہ تیغ یہ سر ہیں
جب دوست نہ بابا کا بچا ہم تو پسر ہیں

یہ کہتے تھے اور روتے تھے وہ ہجر پدر میں — تصویر اجل پھرتی تھی دونوں کی نظر میں
تھا شور منادی کا یہ ہر راہ گزر میں — بیٹوں کو نہ مسلم کے چھپائے کوئی گھر میں
بتلائے کسی حجرے میں گو بند ہیں دونوں
حاکم کے گنہگار کے فرزند ہیں دونوں

معصوم سمجھ کر کوئی رحم اُن پہ نہ کھائے — ہاتھ آئیں تو پکڑے ہوئے دربار میں لائے
مجرم کی کوئی منت و زاری پہ نہ جائے — دانا ہے وہ جو گوہر عزت کو بچائے
جس نے انھیں پنہاں کیا گھر اسکا لٹے گا
مرجائے گا پر قید سے زندہ نہ چھٹے گا

گھبراتے تھے سب سن کے منادی کے یہ مذکور — تھے شہر کے دروازے سر شام سے معمور
دشمن جو علیؑ کے تھے وہ تھے خرم و مسرور — جو دوستدار تھے حیدر کے وہ تھے عاجز و مجبور

باتیں انھیں معصوموں کی ہوتی تھی گھر میں
منھ ڈھانپے ہوئے بیبیاں روتی تھی گھر میں

کہتی تھی کوئی کیا کریں کیونکر انھیں پائیں — جا بوسوں کا خطرہ ہو کہاں ڈھونڈھنے جائیں
جلادوں سے چھپ کر وہ اگر یاں چلے آئیں — ہم دل کی طرح انکو کلیجوں میں چھپائیں
آقا ہیں وہ اسکے جو غلام شہ دیں ہے
ہم لونڈیاں حاضر ہیں جو ماں سر پہ نہیں ہے

کیا روز سیہ چرخ نے بچوں کو دکھایا — ہے ہے نہ چچا سر پہ نہ ہے باپ کا سایا
سات آٹھ برس کا تو سن اور دیس پرایا — جانیں نہ بچیں گی کسی دشمن نے جو پایا
کچھ بس نہیں کس طرح کوئی آہ بچائے
بچو بھتیجیں پردیس میں اللہ بچائے

شیعوں کے گھروں میں تو یہ تھی گریہ و زاری — اور ڈھونڈتے پھرتے تھے انھیں کوفی ناری
ناکے پہ معیں کہہ گئے آکر کئی باری — ہشیار خبردار ہو اگر جان ہے پیاری
احکام میں حاکم کے خلل آنے نہ پائے
ناکے سے کوئی چھپ کے نکل جانے نہ پائے

دو طفل حسین بھاگے ہیں کل قاضی کے گھر سے — کر لیجو گرفتار جو آ نکلیں ادھر سے
خورشید سے ماتھے ہیں تو چہرے ہیں قمر سے — چھوٹے سے عمامے ہیں لپیٹے ہوئے سر سے
گوندھی ہوئی زلفیں بہ سر دوش پڑی ہیں
آنکھیں کہیں آہو کی بھی آنکھوں سے بڑی ہیں

ہر ناکے پہ تھا حکم یہ ان دونوں کی خاطر — دربار میں غل تھا کہ کرو جلد انھیں حاضر
اور پھرتے تھے حیران نہ مدینہ کے مسافر — کوئی نہ مددگار نہ تھا حافظ و ناصر
پھرتی تھی اجل ساتھ جدھر جاتے تھے دونوں — پتا بھی کھڑکتا تھا تو ڈر جاتے تھے دونوں

ناکے تلک آ پہونچے نہ تھے وہ جگر افگار — جو دیکھ لیا ان کو کسی شخص نے اک بار
چلایا کہ بس آگے قدم رکھیو نہ زنہار — جاتے ہو کہاں بھاگے ہم آ پہنچے خبردار
سنتے ہی اس آواز کے گھبرا گئے دونوں
سرتا بقدم بید سے تھرّا گئے دونوں

بھائی سے کہا بھائی نے اب کیا کریں بھائی — اعدا ہمیں لینے نہیں آئے اجل آئی
افسوس کہیں امن کی جا ہم نے نہ پائی — مشکل ہے بہت موت کے پنجہ سے رہائی
آتے ہی بس اب برچھیاں تانیں گے ستمگر
منّت بھی کریں گے تو نہ مانیں گے ستمگر

یہ کہتے تھے جو آن ہی پہونچے وہ جفا جو — اور باندھ لئے رسّی سے اُن دونوں کے بازو
بچوّں پہ اُٹھاتا تھا طمانچہ کوئی بدخو — کہتا تھا کوئی لے چلو کھینچے ہوئے گیسو
وہ کہتے تھے ہم دام بلا میں تو پھنسے ہیں
بازو کہو پھر کس لئے رسّی سے بندھے ہیں

جاتے تھے جو روتے ہوئے وہ گیسوؤں والے — بازار میں بیتاب تھے سب دیکھنے والے
جلّادوں میں معصوموں کے تھے جان کے لالے — تکتے تھے ہر اک کو کہ ہمیں کوئی چھڑا لے
حال اپنا اشارے سے جتاتے تھے کسی کو
رسّی میں بندھے ہاتھ دکھاتے تھے کسی کو

پہونچے انہیں لیکر جو وہ ظالم سر دربار — خدّام نے کی عرض کہ حاضر ہیں گنہگار
تھا تخت مرصع پہ مکیں حاکم غدّار — وحشت سے لرزنے لگے بچوّں کے تن زار
بیٹھے ہوئے واں کرسیوں پہ چھوٹے بڑے تھے
رسّی سے بندھے سامنے معصوم کھڑے تھے

معصوموں سے یوں کہنے لگا حاکم ملعون — اس بھاگنے کی تم کو کہو کیا میں سزا دوں

صدمہ سے یتیموں کا ہوا حال دگرگوں   تھرّا کے وہ یہ کہنے لگے بیکس و محزوں
ہاں قتل ہی کرنے کے سزاوار ہیں ہم بھی
بابا تھے گنہگار گنہگار ہیں ہم بھی

بولا کوئی معصوم ہیں یہ بیکس و دلگیر   دہشت کے سبب کانپتے ہیں رنگ ہے تغیر
یہ پھول سے اندام نہیں لائق تعزیر   نادان ہیں کمسن ہیں کچھ انکی نہیں تقصیر
طاقت ہے کہاں بھاگ کے جاتے یہ کدھر کو
بھولے ہیں بہت ڈھونڈھتے ہوئیں گے پدر کو

چپ رہ گیا وہ دشمن دیں سر کو جھکا کر   زنداں کے نگہباں سے کہا پاس بلا کر
کر قید انھیں حجرۂ تاریک میں جا کر   سُنیو نہ جو منت بھی کریں اشک بہا کر
آرام سے دونوں میں کوئی سونے نہ پائے
قفل در زنداں کبھی وا ہونے نہ پائے

دیکھو نہ خبردار مزے کا انھیں کھانا   گرمی میں بھی ٹھنڈا نہ انھیں پانی پلانا
یہ سحر بیاں ہیں کہیں باتوں پہ نہ جانا   بازو نہ کھلیں رسّی سے جبتکہ میں نہ آنا
دشمن کے ہیں فرزند اذیت انھیں دیجو
کپڑے بھی بدلنے کی نہ فرصت انھیں دیجو

یہ سُن کے انھیں لے گیا زنداں کا نگہباں   اک حجرے میں قیدی ہوئے دونوں مہ تاباں
گھٹنے جو لگا دم تو یہ چلّائے وہ ناداں   در کھول دو للہ نہیں تن سے چلی جاں
بھاگیں گے نہ ہرگز ہمیں حجرے سے نکالو
اک طوق جو ہلکا ہو تو دو طوق پنھا دو

دروازے سے ٹکرائے بہت سر کو وہ ناشاد   مادر کو بھی چلّائے پدر کو بھی کیا یاد
بچوں کی کسی نے نہ سُنی زاری و فریاد   کب کھولتے ہیں طائر پربند کو صیّاد

بیتاب تھے اسطرح وہ چھٹنے کی ہوس میں
جوں تازہ گرفتار پھڑکتا ہے قفس میں

تاریک وہ حجرہ تھا مثال شب ظلمات — معلوم نہ ہوتا تھا کہ کب دن ہوا کب رات
مرقد کے اندھیرے کو بھی اس گھر نے کیا مات — سہمے ہوئے روتے تھے وہ آنکھوں پہ دھرے ہاتھ
تھی پیش نظر وصل میں تنہائی کی صورت
بھائی کو نہ آتی تھی نظر بھائی کی صورت

فاقے میں بسر کرتے تھے دن بھر وہ گل اندام — جو مالک زنداں تھا وہ آتا تھا سر شام
جا بیٹھتے دروازے کے نزدیک وہ گلفام — دیتا انہیں دو روٹیاں اور پانی کے دو جام
تھا خوف زبس ظالم اظلم کے غضب سے
اٹھ اٹھ کے سلام اسکو وہ کرتے تھے ادب سے

کھانا وہ کہاں اور کہاں نازوں کے پالے — رو دیتے تھے جب حلق میں پھنستے تھے نوالے
آپس میں یہی کہتے تھے وہ گیسوؤں والے — قسمت کبھی دشمن پہ بھی یہ وقت نہ ڈالے
پانی بھی تو جی بھر کے نہیں ملتا ہے بھائی
یہ سخت ہے روٹی کہ گلا چھلتا ہے بھائی

سمجھاتا تھا چھوٹے کو بڑا بھائی یہ رو کر — جاگہ نہیں شکوے کی کرو شکر برادر
دیکھو تو کہ سر پر ہے پدر اور نہ مادر — تھوڑا ہے کہ یہ بھی نہیں ہوتا ہے میسر
نعمت سے زیادہ ہمیں یہ نان جویں ہے
منہ اپنا تو اس کھانے کے قابل بھی نہیں ہے

ایسے بھی بہت ہیں جنھیں ملتا نہیں دانا — پینے کو جو پانی ہو تو ملتا نہیں کھانا
بھائی ہے خدا مالک و مختار و توانا — کچھ ایک سا رہتا نہیں دنیا میں زمانا
موت آئی تو اس قید میں مرجائینگے بھائی — جیتے ہیں تو یہ دن بھی گذر جائینگے بھائی

رزاقِ معبودِ حقیقی پہ کرو غور | اس قید میں تھا رزق پہنچنے کا کوئی طور
دینداری سے جو دور ہیں اُن لوگوں کا ہے دور | ہم اور مکاں اور زمیں اور ہوا اور
ہے قید میں جسکی وہی دے جاتا ہے کھانا
ہر طرح خدا بندے کو پہونچاتا ہے کھانا

زنداں میں بھی بھوکا نہ کبھی ہم کو سُلایا | دن بھر جو میسّر نہ ہو رات کو کھلایا
خاصانِ خدا نے بھی سدا رنج اُٹھایا | دُکھ فاقہ کشی کا تو ہے میراث میں پایا
عسرت رہی دنیا میں شہِ عقدہ کشا کو
فاقے تو گزر جاتے تھے محبوبِ خدا کو

یہ قید کے دن شکرِ الٰہی میں گذارو | جو رنج بھی مجبور ہو دم اس میں نہ مارو
صابر رہو شاکر رہو ہمّت کو نہ ہارو | روٹی جو پھنسے پانی کے گھونٹوں سے اتارو
رزاقِ دو عالم کی عنایت اسے سمجھو
گر صبر کی لذّت ہو تو نعمت اسے سمجھو

تقلیل غذا قید کا دُکھ باپ کا ماتم | گھل گھل کے برس دن میں عجب ہو گیا عالم
چھوٹا یہی کہتا تھا بڑے بھائی سے ہر دم | فریاد رسی کون کرے کس سے کہیں ہم
افسوس یونہی عمر چلی جاتی ہے بھائی
نہ قید سے چھٹتے ہیں نہ موت آتی ہے بھائی

پہونچا دیا اس غم نے ہمیں گور کنارے | مٹی نہ وطن کی تھی نصیبوں میں ہمارے
جیتے ہیں مگر موت کے آثار ہیں سارے | مرجائیں تو مرقد میں ہمیں کون اُتارے
ہم سا بھی کوئی بیکس و مظلوم نہ ہوگا
مرنا بھی کسی شخص کو معلوم نہ ہوگا

کسطرح کہیں بھول گئی ہوویں گی مادر | سب بیٹوں سے اپنے انھیں الفت تھی برابر

کیا جانے کس آفت میں ہے فرزند پیمبر — وہ قید سے غیروں کو چھڑا دیتے ہیں اکثر
سنتے تو مدد آن کے بھائی کی نہ کرتے
تدبیر وہ بچوں کی رہائی کی نہ کرتے

کہتے تھے جو وہ وا ہوا قفل درِ زنداں — اور دینے لگا آب و غذا اُن کو نگہباں
چھوٹے نے بگڑے ہو کے کہا با تنِ لرزاں — ہم تجھ کو دعا دیتے ہیں اے مرد مسلماں
پینے کو نہ پانی نہ غذا چاہتے ہیں ہم
کچھ حال جو سنئے تو کہا چاہتے ہیں ہم

جو تو نے دیا شکر کیا اور وہی کھایا — جی بھر کے اگر پانی نہ پایا تو نہ پایا
بھڑکی جو بہت پیاس تو اشکوں سے بجھایا — شکوے کا مگر حرف زباں پر نہیں لایا
واقف ہے کہ کھانا کبھی دن بھر نہیں مانگا
سونے کے لئے رات کو بستر نہیں مانگا

گذرا ہے برس روز ہمیں خاک پہ سوتے — پانی نہ ملا اتنا کہ کرتوں کو تو دھوتے
چلاّ کے ترے ڈر سے نہیں رات کو روتے — قیدی چھٹے اکثر پہ رہا ہم نہیں ہوتے
ہم سے ترا اسرار عبث برسر کیں ہے
کچھ جرم نہیں ہے کوئی تقصیر نہیں ہے

تو رحم کر اے شخص کہ بے جرم و خطا ہیں — وارث کوئی سر پر نہیں پابند بلا ہیں
لڑکے ہیں ستم کش ہیں غریب الغربا ہیں — احساں کو نہ بھولیں گے کہ ہم اہل وفا ہیں
اب قید کی تکلیف اٹھائی نہیں جاتی
روٹی بھی کئی روز سے کھائی نہیں جاتی

رکھتا ہے بڑا اجر اسیروں کو چھڑانا — بھوکوں کو طلب کر کے سخی دیتے ہیں کھانا
رہ جاتا ہے عالم میں کریموں کا فسانا — نیکی جو کرے نیک اُسے کہتا ہے زمانا

محتاج ہیں یاں اور تو کیا دیوینگے تجھ کو
کام آ جو ہمارے تو دعا دیوینگے تجھ کو

دونوں نے فصاحت سے سخن جب یہ سنائے — زنداں کے نگہباں کے بھی آنسو نکل آئے
ہاتھ اسکی دعا کے لئے دونوں نے اٹھائے — پایا متوجہ تو سخن لب پہ یہ لائے
کچھ رتبۂ محبوب خدا جانتا ہے تو
اے شخص محمدؐ کو بھی پہچانتا ہے تو

وہ کہنے لگا ان سے میں کیونکر نہیں آگاہ — مختار جہاں ختم رسل سید ذی جاہ
لڑکوں نے کہا حیدر صفدر سے بھی ہے راہ؟ — بولا مری تسبیح ہے نام اسد اللہ
نائب ہے مددگار ہے یاور ہے نبی کا
حیدر تو چچازاد برادر ہے نبی کا

یہ سنتے ہی جان آگئی ان دونوں کے تن میں — کم ہو گیا دہشت سے جو لرزہ تھا بدن میں
خشکیدہ زباں کرنے لگی شکر دہن میں — گویا کہ بہار آگئی ہستی کے چمن میں
چہرے سے خوشی ہو کے وہ مہ رو نکل آئے
اک بھائی ہنسا ایک کے آنسو نکل آئے

بولے کہ ہم اے شخص محمدؐ کے جگر ہیں — چھوٹے نہیں دریائے صداقت کے گہر ہیں
جو قتل ہوئے یاں نہ ہمارے ہی پدر ہیں — واللہ ہمیں مسلم بیکس کے پسر ہیں
تو کہتا ہے احمدؐ کو پیمبرؐ ہے ہمارا
جو گھر ہے محمدؐ کا وہی گھر ہے ہمارا

یہ سنتے ہی تھرا گیا وہ مرد خوش اطوار — معصوموں کے قدموں پہ گرا دوڑ کے اک بار
کہتا تھا میں اس حال سے واقف نہ تھا زنہار — بخشو مجھے میں نے تمھیں گھڑکا تھا کئی بار
جو آپ کے لائق تھا وہ لایا نہیں کھانا — سچ ہے کہ مزے کا کبھی کھایا نہیں کھانا

میں تم پہ فدا اے اسد اللہ کے پیارو — کرتے ہیں نئے لاؤں یہ ملبوس اتارو
بندہ ہیں تمھارا ہوں مجھے قدموں پہ وارو — لو زادِ سفر مجھ سے جدھر چاہو سدھارو
شکوہ مرا اللہ و پیمبر سے نہ کیجو
جنت میں شکایت مری حیدر سے نہ کیجو

قدموں سے اٹھا کر وہ سخن لب پہ یہ لائے — تو خالقِ اکبر سے جزا حشر میں پائے
دنیا کی ہر آفت سے خدا تجھ کو بچائے — حامی ہوں تری فاطمہ جب حشر میں جائے
واقف نہیں ہم راہ بتا دے تو رواں ہوں
بھائی کے ترے بچے ترے سائے میں جواں ہوں

دینے لگا وہ ذکر انھیں وہ درہم و دینار — شرما کے یہ کہنے لگے وہ بیکس و ناچار
احسان ترا تھوڑا ہے اے مردِ خوش اطوار — توشہ ہے توکل ہمیں کچھ بھی نہیں درکار
بتلا دے پتہ ہم کو جگر بند نبی کا
لشکر ہے کہاں سبطِ رسولِ عربی کا

کعبے سے ادھر بھیجا تھا بابا کو ہمارے — یاں آن کے ہم قید ہوئے وہ گئے مارے
ساتھ ان کے تھے سب حیدرِ کرار کے پیارے — مکّے میں ابھی ہیں کہ کہیں دور سدھارے
کَے راتیں ہمیں کاٹنی ہووینگی وطن تک
کَے روز میں پہونچیں گے شہنشاہِ زمن تک

حضرت کی خبر کچھ جو سنی ہو تو سنا دے — جو راہ کہ نزدیک ہو وہ ہم کو بتا دے
جس سمت چچا ہوں اسی رستے پہ لگا دے — کیا دور ہے خالق ہمیں بچھڑوں سے ملا دے
مطلوب زیارت ہے ہمیں شاہِ زمن کی
کعبے کی طرف جائیں کہ لیں راہ وطن کی

چاہا بہت اس نے کہ یہ بچوں سے چھپائے — مظلوم کا جو ذکر تھا آنسو نکل آئے

گھبرا کے وہ معصوم سخن لب پہ یہ لائے　　کیوں خیر تو ہے آنکھوں سے کیوں اشک بہائے
وہ کہنے لگا بیکس و مجبور ہیں شبیرؑ
تم جا نہیں سکتے کہ بہت دور ہیں شبیرؑ

جب رونے لگے وہ تو کچھ اس کو نہ بن آیا　　سر پیٹ کے ہاتھوں سے یہ بچوں کو سنایا
دنیا میں کہاں ہے اسد اللہ کا جایا　　گھر فاطمہ کا خاک میں اعدا نے ملایا
شبیرؑ کے لشکر کا جواں کوئی نہیں ہے
عابدؑ کے سوا فاتحہ خواں کوئی نہیں ہے

عاشور کے دن ذبح ہوئے سبط پیمبرؐ　　خیمے بھی جلائے گئے تاراج ہوا گھر
رانڈوں کا ستمگاروں نے لوٹا زر و زیور　　افسوس کہ زینبؑ کی بھی چھینی گئی چادر
دیکھا حرم شاہ نے دربار دمشق کا
کوفہ میں سر آیا تھا حسین ابن علیؑ کا

دنیا میں نہ اکبر ہیں نہ عباس نہ شبیرؑ　　سب چھوٹے بڑے ہو گئے زیر دم شمشیر
یاں تک کہ ہوئے کشتہ علی اصغر بے شیرؑ　　مٹی میں نہاں ہو گئی ایک ایک کی تصویر
کیونکر اسد اللہ کے پیاروں سے ملوگے
اب جا کے ملو گے تو مزاروں سے ملوگے

یہ سنتے ہی معصوموں پہ اک شدت ہوئی طاری　　تڑپے یہ زمیں پر کہ غش آیا کئی باری
گھبرا کے وہ بولا نہ کرو گریہ و زاری　　دشمن کوئی گر سن لیوے آواز تمھاری
ظالم ہے وہ حاکم سے نہیں زور کسی کا
یاں ڈھونڈھ کے خوں کرتے ہیں فرزند علیؑ کا

دلگیر ہو کے وہ بولا کہ مناسب نہیں تاخیر　　بہتر ہے اسی شب میں نکل جانے کی تدبیر
جلدی سے اٹھے واں سے وہ با حالت تغیر　　باندھیں کمریں اور وہ بچے ہوئے رہگیر

یوں نکلے یہ تعجیل اسیری کے محن سے
جس طرح گریزاں ہو قمر چھٹ کے گہن سے

وہ شہر پر آشوب وہ غربت وہ شب تار — ایک ایک قدم خوف نہ رہبر نہ مددگار
"ہاں جاگتے رہیو" یہ عسس کہتے تھے ہر بار — دل انکے دھڑکتے تھے لرزتے تھے تن زار
پیچھے کبھی ہٹ جاتے تھے گہ بڑھتے تھے دونوں
ڈر ڈر کے کبھی نادعلی پڑھتے تھے دونوں

پھرتے رہے قسمت نے نہ کی راہ نمائی — رستہ نہ ملا جانے کا اور نصف شب آئی
چھوٹے نے کہا چلنے کی طاقت جو نہ پائی — اب تو ہمیں نیند آتی ہے ٹھہرو کہیں بھائی
کہتا تھا بڑا ہیں ابھی دن سخت ہمارے
سو جاؤ گے جو بیدار ہوئے بخت ہمارے

دم لیتے کبھی گاہ قدم جلد اٹھاتے — سہمے ہوئے مڑ مڑ کے کبھی دیکھتے جاتے
تنہائی پہ آنکھوں سے کبھی اشک بہاتے — گر پڑتے کبھی اور کبھی ٹھوکریں کھاتے
چڑھ جاتی نقاہت سے جو دم ہانپنے لگتے
سایہ نظر آتا تو بدن کانپنے لگتے

لب پر نفس سرد بھرے آنکھوں میں آنسو — غربت زدہ پھرتے تھے سراسیمہ وہ گلرو
تھا ہاتھ میں چھوٹے کے بڑے بھائی کا بازو — دھڑکا تھا کہیں گھیر نہ لیں آ کے جفا جو
چل سکتے تھے دونوں نہ ٹھہر سکتے تھے دونوں
گھبرائے ہوئے چاروں طرف تکتے تھے دونوں

اک پیر زن اتنے میں نظر آ گئی ناگاہ — داماد کے آنے کی کھڑی دیکھتی تھی راہ
یوں کہنے لگے اس سے بعد عجز وہ ذی جاہ — اک دوپہر اس گھر میں اماں دے ہمیں للہ
معصوم ہیں ہم بے وطن و زار و حزیں ہیں — مظلوم ہیں سید ہیں گنہگار نہیں ہیں

اس بستی میں دیندار نظر آئی تو ہمیں — وہ بولی کہ تم دونوں ہو کس باغ کے گلرو
تم سے تو عجب طرح کی آتی مجھے خوشبو — کہنے لگے تب چپکے سے وہ دیکھ کے ہر سو
رکھتے ہیں قرابت تو رسولِ عربی سے
مسلم کے پسر ہیں، ہیں کہیو نہ کسی سے

وہ بولی کہ آنکھوں پہ رکھوں تم کو میں دن رات — پر صاحب خانہ ہے بڑا فاسق و بدذات
حاکم کا تو وہ دوست ہے اور دشمن سادات — گر دیکھ لیا اُس نے تو بننے کی نہیں بات
لونڈی ہوں میں زہرا کی تمہارا ہی یہ گھر ہے
گر ہے تو اُسی ظالم بدذات کا ڈر ہے

وہ بولے کہ خالق کرے رتبہ ترا عالی — واقف نہیں ہم راہ سے اور رات ہے کالی
درکار ہے نہ فرش نہ تکیہ نہ نہالی — تو ہم کو چھپا رکھ کوئی حجرہ جو ہو خالی
بن باپ کے ہیں ہم پہ مصیبت یہ نئی ہے
شاید وہ نہ آئے کہ بہت رات گئی ہے

دونوں نے یہ منت جو کہا اس سے بہ دُرد — تھی مومنہ معصوموں پہ رحم آ گیا اُس کو
کہنے لگی میں تم کو چھپا رکھوں گی کچھ ہو — میں صدقے گئی آؤ مری بی بی کے پیارو
مہمان ہوئے جا کر ستم ایجاد کے گھر میں
دونوں کو اجل لے گئی جلاد کے گھر میں

جنگ کربلا کا سب سے زیادہ درد انگیز سین وہ ہے کہ حضرت امام اپنے شش ماہہ بچے کو جو پیاس سے نیم جاں ہو رہا تھا خیمے سے لاتے ہیں اور اتمام حجت کے لیے دشمنوں سے پانی طلب کرتے ہیں۔ اس واقعہ کو مرزا دبیر نے بھی نہایت بلاغت سے بیان فرمایا ہے مگر میر صاحب کی زبان سے لطافت ہی اور ہے۔

شہادت حضرت علی اصغر

بچے کو لئے گھر سے جو نکلے شہِ والا (۱) تھی دھوپ میں تیزی کہ ہرن ہوتا تھا کالا
نکلا تھا کبھی گھر سے نہ وہ ہنسلیوں والا دامانِ عبا چہرۂ فرزند پہ ڈالا
روتا تھا تو چھاتی سے لگا لیتے تھے شبیر
ہر گام پہ دامن کی ہوا دیتے تھے شبیر

یوں کہنے لگے دیکھ کے آپس میں ستمگر (۲) یہ کیا ہے جو ہاتھوں پہ لئے ہیں شہِ صفدر
بولا کوئی ہے زیرِ عبا مصحفِ داور تا صلح کریں ہم سے اُسے بیچ میں دے کر
معلوم ہوا جنگ سے گھبراتے ہیں شبیرؑ
قرآں کو شفاعت کے لئے لاتے ہیں شبیرؑ

بولا کوئی بیدرد نہیں یہ نہیں اصلا (۳) ہے صابر و شاکر پسرِ حضرتِ زہراؑ
سادات پہ اس دشت پہ ہے تیسرا فاقہ بے جان ہوا ہوگا کسی سیدانی کا بچہ
اشک آنکھوں میں ہیں چاک گریباں کئے ہیں
میت کسی معصوم کی شبیرؑ لئے ہیں

سُنکر یہ کلام اُن کا پکارے شہِ عادل (۴) تم تو نہ محمدؐ کے نہ قرآن کے ہو قائل
میت ہے نہ قرآن ہے یہ فقرہ جاہل! یہ مصحفِ ناطق کے گلے کی ہے حمائل
دیکھو مری مظلومی و اندوہ و قلق کو
لے آیا ہوں زہراؑ کے صحیفے کے ورق کو

یہ چھوٹا سا سید بھی ہے مہمان تمہارا (۵) کیا تم کو ملے گا جو اسے پیاس نے مارا
یہ فرش کی زینت ہے تو ہے عرش کا تارا میرا بھی جگر بند ہے اور ماں کا بھی ہے پیارا
کچھ پانی کے بدلے تمہیں لینا ہو تو کہہ دو
دریا سے کوئی قطرہ جو دینا ہو تو کہہ دو

طالب ہو اگر زر کے تو زر بھیجیو مجھ سے (۶) قطرے کے عوض لعل و گہر بھیجیو مجھ سے
پانی دو دعا سے خلد میں گھر بھیجیو مجھ سے — خالی ہو اگر نہر تو بھر بھیجیو مجھ سے

معصوم ہے بے آب کبھی جی نہ سکے گا
اک جام تو یہ تشنہ دہن پی نہ سکے گا

مارا جنھیں برچھی سے اُنھیں کا ہے یہ بھائی (۷) اٹھارہ برس کے تھے وہ جن کی اجل آئی
یہ لال ہے میرا چھ مہینے کی کمائی — مر جائے گی ماں گر ہوئی اُس سے بھی جدائی

بہنوں کی یہ ہے جان تو پھپھیوں کا جگر ہے
مر جانے میں اس کے کئی جانوں کا ضرر ہے

میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ پانی مجھے لا دو (۸) خود تم ہی اسے آن کے چُلّو سے پلا دو
مرتا ہے یہ مرتے ہوئے بچے کو جِلا دو — للّٰہ کلیجے کی مرے آگ بجھا دو

جب مُنھ مرا تکتا ہے یہ حسرت کی نظر سے
اے ظالمو اٹھتا ہے دھواں میرے جگر سے

بجھتی نہیں جب آگ کلیجے میں لگی ہو (۹) جانے وہی اولاد خدا نے جسے دی ہو
سُوچے وہ قضا جس کے جگر بند نے کی ہو — انصاف کرے دل پہ چھُری جس کے چلی ہو

غمگیں ہو تو سوزِ نفسِ سرد کو سمجھے
جس دل میں نہ ہو درد وہ کیا درد کو سمجھے

اولاد کی فرقت کوئی پوچھے مرے جی سے (۱۰) بیٹے کی محبت کوئی پوچھے مرے جی سے
یہ دُکھ یہ مصیبت کوئی پوچھے مرے جی سے — اس درد کی لذّت کوئی پوچھے مرے جی سے

اک یادِ الٰہی تو فراموش نہیں ہے
یہ جوشش ہے غم کا کہ مجھے ہوش نہیں ہے

میں خوب سمجھتا ہوں کہ ہو ظلم کے بانی (۱۱) یہ کیا ہے کہ پھر تم سے طلب کرتا ہوں پانی

جان اپنی میں دیتا ہوں جو بچ جائے یہ جانی   مرجاؤں میں پر اسکی مٹے تشنہ دہانی
جب سوئے عدم خلق سے منھ موڑ کے جاؤں
حسرت ہو کہ پیاسا ہیں اسے چھوڑ کے جاؤں

یہ کہہ کے اٹھایا رخِ بے شیر سے دامن   (۱۲) چہرے کی تجلی سے جہاں ہو گیا روشن
دیکھی جونہی وہ چاند سی ڈھلتی ہوئی گردن   کیا ذکر بھلا دوست کا رونے لگے دشمن
ہر چند کہ سب ظالم و جلاد تھے اُن میں
تھرا گئے جو صاحبِ اولاد تھے اُن میں

کی آہ کسی نے کوئی منھ پھیر کے رویا   (۱۳) دامن کسی جلاد نے اشکوں سے بھگویا
ہر شخص کے اک تیر لگا قلب پہ گویا   بولا کوئی ایماں بھی گیا دین بھی کھویا
یوں پھول کوئی دھوپ میں مرجھا نہیں جاتا
بچے کا یہ عالم ہے کہ دیکھا نہیں جاتا

بولا کوئی کیا پانی کے دینے میں ضرر ہے   (۱۴) معصوم ہے مظلوم ہے اور تشنہ جگر ہے
بولا کوئی بچہ ہے ترا دھیان کدھر ہے   دشمن سمجھ اس کو کہ یہ دشمن کا پسر ہے
پچھتائیگا کل آج جو پانی اسے دے گا
یہ طفل جواں ہو کے عوض باپ کا لے گا

تب شمر پکارا کہ ہمیں رحم نہیں ہے   (۱۵) یہ غنچہ دہن کیا علی اکبر سے حسیں ہے
حضرت نے کہا یہ تو مرے دل کو یقیں ہے   اس فوج میں اک ایک شقی دشمنِ دیں ہے
بے صبر نہیں گو کہ گرفتارِ قلق ہوں
حجت نہ رہے کوئی کہ میں حجتِ حق ہوں

یہ سُن کے بڑھا صف سے بن کاہل بے پیر   (۱۶) پیاسے علی اصغر کے ہوئی قتل کی تدبیر
جوڑا ستم ایجاد نے چلے میں ادھر تیر   چھاتی تلے بچے کو چھپانے لگے شبیر

چلاتے تھے سہم کے یہ کیا کرتا ہے ظالم
بچے کو جو تاکا تو خطا کرتا ہے ظالم

کب سنتا ہے فریاد کسی کی ستم آرا (۱۷) اک تیر ستم تاک کے معصوم کو مارا
ڈھلکی ہوئی گردن پہ لگا تیر قضا را بس چونک پڑا سہم کے وہ باپ کا پیارا
اشک آنکھوں سے شبنم کی طرح رخ سے ڈھل آئے
ننھے سے انگوٹھے بھی دہن سے نکل آئے

گھبرا کے سری کو جو لگے کھینچنے سرور (۱۸) سب خون سے گرنا بھی شلوکا بھی ہوا تر
تھرانے لگے ننھے سے وہ بازوئے انور ڈھیلے ہوئے ہاتھوں سے گرے پھر گئے تیور
بیتابی میں شہ بیٹھ گئے خاک پر ہٹ کر
وہ غنچہ دہن مر گیا بابا سے لپٹ کر

بیٹے بھتیجے بھانجے سب قتل ہو چکے۔ تشنہ کام معصوم بھی آغوش مبارک میں جام شہادت سے سیراب ہو چکا۔ اب صرف جناب حسینؑ تنہا باقی ہیں اور آخری رخصت کو خیمہ میں تشریف لے جاتے ہیں۔

رخصت حضرت امام حسینؑ

روتے ہوئے حرم میں گئے قبلۂ انام (۱) تر تھی لہو سے لخت جگر کے قبا تمام
رخ زرد دل میں درد بدن سُتر تشنہ کام طاقت نہ قلب میں نہ بدن میں لہو کا نام
یہ درد تھا بکا میں کہ دل ٹکڑے ہوتے ہیں
یہ حال تھا کہ رونے پہ دشمن بھی روتے ہیں

پیارے نہ تھے حسین علیہ السلام کے (۲) لائی حرم سرا میں بہن ہاتھ تھام کے
خنجر الٰہی تھے پاؤں شہ تشنہ کام کے سر دوش پر تھا زینب عالی مقام کے
فرماتے تھے بہن علی اکبر گذر گئے ہم ایسے سخت جاں تھے کہ اب تک نہ مر گئے

سر بار دوش ہے ہمیں رخصت کرو بہن (۳) اب عنقریب خیمۂ عصمت ہیں تیغ زن
مردے پڑے ہوئے ہیں عزیزوں کے بے کفن پامال ہو نہ لاشۂ فرزند صف شکن

مجبور ہم ہیں قاسم بے پر کی روح سے
شرمندگی نہ ہو علی اکبر کی روح سے

یہ سُنکے بیبیوں کے جگر پر چھری چلی (۴) زینبؑ زمیں پہ گر کے پکاری کہ یا علیؑ
عترخمی جہاں کے ہیں سب آپ پر جلی جاتا ہے سرکشوں میں یہ کونین کا ولی

بے کس کو آسرا ہے بسیر کا نہ بھائی کا
آقا یہی تو وقت ہے مشکل کشائی کا

فرمایا شہ نے صبر بہن چاہیئے تمہیں (۵) خالق کی یاد سرّ و علن چاہیئے تمہیں
لب پر رضا کا سخن چاہیئے تمہیں جو ماں کا تھا چلن وہ چلن چاہیئے تمہیں

ہر بار پوچھتے تھے سبب آہ سرد کا
شکوہ کیا علی سے نہ پہلو کے درد کا

یہ سچ کہ تم کو مجھ سے محبت ہے اے بہن (۶) کیا کیجے ناگزیر یہ فرقت ہے اے بہن
پیارے تمہارے بھائی کی رحلت ہے اے بہن دنیا مقام رنج و مصیبت ہے اے بہن

بھولے نہ یاد حق کبھی گو حال غیر ہو
اُس کی ظفر ہو خاتمہ جس کا بخیر ہو

دیکھا یہ کہہ کے بالی سکینہ کو یاس سے (۷) لپٹی وہ دوڑ کر شہ گردوں اساس سے
طاقت نہ تھی کلام کی ہر چند پیاس سے بولی وہ تشنہ کام شہ حق شناس سے

کیا اس بلا کے بن سے تہیہ سفر کا ہے
صدقے گئی بتاؤ ارادہ کدھر کا ہے

فرمایا شہ نے ہاں سفر ناگزیر ہے (۸) آؤ گلے لگو کہ یہ صحبت اخیر ہے

اب آرزوئے قربِ خدائے قدیر ہے
تنہا ہیں ہم سپاہ مخالف کثیر ہے
طے ہو یہ مرحلہ جو اعانت خدا کرے
جس کا نہ کوئی دوست ہو بی بی وہ کیا کرے

سُنکر مصیبت پدر بے کس و حزیں (۹) بولی بلائیں باپ کی لیکر وہ مہ جبیں
نکلو بلا کے بن سے کہیں یا امام دیں
آقا سوا حضور کے میرا کوئی نہیں
صدقے گئی مدینہ چلو یا نجف چلو
لِلّٰہ ساتھ لو مجھے تم جس طرف چلو

شہ نے کہا کہ بند ہیں راہیں پدر نثار (۱۰) پھیلی ہوئی ہے چار طرف فوج نابکار
پیدل نکلنے پاتا ہے ناکوں سے نہ سوار
اس دست کیں میں قید ہے احمدؐ کا یادگار
قاصد جو میرے نام کا خط لیکے آتے ہیں
سر کاٹ کر درختوں میں لٹکائے جاتے ہیں

جانا ہو دور شب کو جو آنا نہ ہو ادھر (۱۱) ضد کر کے رو ٹیو نہ ہمیں جانتی ہو گر
پہلے پہل ہے آج شبِ فرقتِ پدر
سو رہیو ماں کی چھاتی پہ نہ ترتبت سے رکھکے سر
راحت کے دن گذر گئے یہ فصل اور ہے
اب یوں بسر کرو جو یتیموں کا طور ہے

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولی وہ تشنہ کام (۱۲) بتلائیے مجھے کہ یتیمی ہے کس کا نام
آنکھوں سے خون بہا کے یہ کہنے لگے امام
کھل جائے گا یہ درد و الم تم پہ تابہ شام
بی بی نہ پوچھو کچھ یہ مُصیبت عظیم ہے
مر جائے جس کا باپ وہ بچہ یتیم ہے

یہ کہکے پیاری بیٹی سے دیکھا ادھر ادھر (۱۳) پوچھا کدھر ہیں بانوے ناشاد نوحہ گر
فضہ نے عرض کی کہ ادھر پیٹتی ہیں سر
رخصت کی بھی حضور کے اُن کو نہیں خبر

لب پر گھڑی گھڑی علی اکبر کا نام ہے
چلئے ذرا کہ کام اب اُن کا تمام ہے

روتے ہوئے وہاں جو گئے شاہ خوشخصال (۱۴) دیکھا کہ غش ہیں خاک پہ بکھرے ہوئے ہیں بال
شبیر بیٹھ کر یہ پکارے بصد ملال اے شہر بانو ہوش میں آؤ یہ کیا ہے حال
سچ ہے فلک نے تم کو بڑے دُکھ دکھائے ہیں
صاحب اُٹھو ہم آخری رخصت کو آئے ہیں

سُنکر صدا حسین کی چونکی وہ نوحہ گر (۱۵) کی عرض سر جھکا کے قدم پر بچشم تر
تنہا حضور آئے ہیں باندھے ہوئے کمر صاحب کہاں ہے ہنّتوں والا امر اپسر
ایسے نہیں جو دُکھ میں جُدا ہوں وہ باپ سے
اپنے مرادوں والے کو میں لوں گی آپ سے

باتیں یہ سُنکے کہنے لگے شاہ بحر و بر (۱۶) یارب جدا نہ ہو کسی ماں سے جواں پسر
بانو کسے بلاؤں کہاں ہے وہ سیم بر ہمشکل مصطفےٰ تو گئے فاطمہ کے گھر
ہر دُکھ میں صبر کرتے ہیں جو حق شناس ہیں
جس نے تمہیں دیا تھا وہ اب اسکے پاس ہیں

جاگے ہوئے تھے رات کے نیند آ گئی انھیں (۱۷) ہے ہے منافقوں کی نظر کھا گئی انھیں
مخفی بہت کیا پہ اجل پا گئی اُنھیں صحرائے کربلا کی فضا بھا گئی انھیں
زندہ نہ ہو گا لال اگر مر بھی جاؤ گی
اب تو کوئی گھڑی میں اسے بھی نہ پاؤ گی

دامن پکڑ کے شاہ کا بولی وہ دل فگار (۱۸) اے فاطمہؑ کے یہ کنیز آپ کے نثار
بعد آپ کے جو لوٹنے آئیں ستم شعار بیٹھیں کہاں یہ بیکس و غمخوار سوگوار
کچھ حق ہیں اس کنیز کے فرما کے جائیے
صاحب کسی جگہ مجھے بٹھلا کے جائیے

میں وہ ہوں جو کہ قید میں آئی تھی یا امام (۱۹) مشہور ہوں کنیز امام فلک مقام
پاس آپکے ہے نانا کا اے قبلۂ انام گر قید ہو گئی تو کہیں گے یہ خاص و عام
بندی چلی ہے شام کو آل رسولؐ کی
دیکھو یہی بہو ہے علیؑ و بتول کی

فرمایا شہ نے حافظ و حامی ہے ذوالجلال (۲۰) زہرا کی بیٹیوں کی رہو تم شریک حال
زینب کو دیکھ سر پہ نہ بھائی نہ دونوں لال صاحب تمہارے ساتھ ہے عابد سا خوشخصال
بے وارثوں کا وارث و والی آلہ ہے
دیکھو ڈگے نہ پاؤں کہ مشکل کی راہ ہے

لو الوداع لاش پہ اب آ کے رو دیجو (۲۱) لیکن نہ خاک اُڑا کے نہ چلا کے رو دیجو
زانو پہ سر کو شرم سے منھ کو چھپا کے رو دیجو قبر رسولِ پاک پہ ہاں جا کے رو دیجو
لٹنے میں صبر و شکر تباہی میں چاہیئے
رونا بشر کو خوف الٰہی میں چاہیئے

مناظر قدرت کی تصویر کشی میں میر صاحب کو وہ ید طولیٰ حاصل تھا کہ مولف المیزان (با وجودیکہ موازنۂ شبلی کا جواب لکھتے اور نشۂ الفت کلام دبیر سے سرشار ہیں) تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے کہ مناظر قدرت کشی میں میر انیس لاجواب شاعر تھے۔

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

میر صاحب کبھی صبح کی دل آویزی بیان کرتے ہیں۔ کبھی رات کی تاریکی۔ قندیلوں کی روشنی کا تذکرہ کرتے ہیں کبھی موسم کی گرمی۔ دھوپ کی تیزی۔ لو کی شدت۔ پیاس کی تکلیف کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ لیکن ہر جگہ اظہار جذبات میں صادق البیان ہیں۔ غم انگیز اشارے جو مرثیت کی جان ہیں ہر

نہیں ہوتے اور مجلس ماتم کو محفل مشاعرہ بننے دیتے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

صبح

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح (۱) گلزار شب خزاں ہوئی آئی بہار صبح
کرنے لگا فلک زر انجم نثار صبح سرگرم ذکر حق ہوئے طاعت گذار صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں کا دمبدم (۲) مرغان باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

وہ نور صبح اور وہ صحرا وہ سبزہ زار (۳) تھے طائروں کے غول درختوں پہ بیشمار
چلنا نسیم صبح کا رہ رہ کے بار بار کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے در دریچے باغ بہشت نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں (۴) تھا جسکی ضو سے وجد میں طاؤس آسماں
ذروں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں نہر فرات بیچ میں تھی مثل کہکشاں
ہر نخل پر ضیائے سر کوہ طور تھی
گویا فلک سے بارش باران نور تھی

اوج زمیں سے پست تھا چرخ زبرجدی (۵) کوسوں تھا سبزہ زار سے صحرا زمردی
ہر خشک و تر پہ تھا کرم بحر سرمدی بے آب تھے مگر در دریائے احمدی
روکے ہوئے تھی نہر کو امت رسول کی سبزہ ہرا تھا خشک تھی کھیتی بتول کی

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد (۶) مخمل سی وہ گیاہ وہ گل سبز و سرخ و زرد
رکھتی تھی پھونک پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد — یہ خوف تھا کہ دامن گل پر پڑے نہ گرد
دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

تھی بسکہ روزِ قتل شہ آسماں جناب (۷) نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب
تھی نہر علقمہ بھی خجالت سے آب آب — روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب
پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

طے کر چکا جو منزل شب کاروانِ صبح (۸) ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح — ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شب تار ہو گیا
عالم تمام مطلع انوار ہو گیا

خورشید نے جو رخ سے اٹھائی نقاب شب (۹) در کھل گیا سحر کا ہوا بند باب شب
انجم کی فرد فرد سے لے کر حساب شب — دفتر کشائے صبح نے الٹی کتاب شب
گردوں پہ رنگ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطانِ غرب و شرق کا نظم و نسق ہوا

یوں گلشن فلک سے ستارے ہوئے رواں (۱۰) چن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گل مہتاب پر خزاں — مرجھا کے گر گئے ثمر و شاخ کہکشاں
دکھلائے طور باد سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور (۱۱) یادِ خدا میں زمزمہ پردازی طیور

وہ رونق اور وہ سرد ہوا وہ فضا وہ نور　　خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انساں زمیں پہ محو فلک آسماں پہ
جاری تھا ذکر قدرت حق کا زباں پہ

وہ سرخی شفق کی ادھر چرخ پر بہار (١٢) وہ بارور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار　　پھولوں سے وہ بھرا ہوا دامان کوہسار
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

تھی دشت کربلا کی زمیں رشک آسماں (١٣) تھا دور دور تک شب مہتاب کا سماں
چھٹکے ہوئے ستاروں کا ذروں پہ تھا گماں　　نہر فرات بیچ میں تھی مثل کہکشاں
سرسبز جو درخت تھا وہ نخل طور تھا
صحرا کے ہر نہال کا سایہ بھی نور تھا

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور (١٤) دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوج طور
پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور　　وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھے وادی مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک (١٥) شرمائے جس سے اطلس زنگاری فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک　　ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار (١٦) پھولوں پہ جا بجا وہ گہرہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار　　بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار

خواہاں تھے زیب گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم (۱۷) کو کو کا شور نالۂ حق سرہ کی دھوم
سُبحان ربنا کی صدا تھی علی العموم جاری تھے وہ جوان کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوک زباں تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار (۱۸) اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یا حی یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار تسبیح تھی کہیں کہیں تہلیل کردگار
طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

رات

کھولا عروس شب نے جو زلف سیاہ کو (۱) روشن کیا سپہر نے قندیل ماہ کو
ضو دے کے اختروں کے چراغوں نے راہ کو پُرنور کر دیا فلک بارگاہ کو
جلوہ تھا یوں ستاروں کا اُس دن کی رات میں
افراط روشنی کی ہو جیسے برات میں

تھی بسکہ عقد قاسمؑ نوشاہ کی وہ رات (۲) نور سحر کو جلوۂ شب نے کیا تھا مات
تھی شرم سے حجاب میں پنہاں شب برات روشن تھی مثل مطلع خورشید کائنات
جلوہ عیاں تھا قدرت پروردگار کا
عالم تھا آدھی رات کو نصف النہار کا

تھا اک طرف تو جلوۂ مہتاب آسماں (۳) اک سمت اختروں کے چراغوں کا وہ سماں
کم تھی وہ جا جہاں میں نہ ہو روشنی جہاں افشاں چنے ہوئے تھی ستاروں کی کہکشاں

جلوہ جدا تھا عقد ثریا کے نور کا
روشن تھا جھاڑ بام فلک پہ بلور کا

تاباں تھے بحر و بر و بیابان و کوہسار | اک اک شجر پہ سرو چراغاں کی تھی بہار
تحریک سے ہوا کے جو ہلتے تھے برگ و بار | گرتا تھا نور چھن کے درختوں سے بار بار
ہر دم تھا چاندنی سے فزوں نور چھاؤں کا
تھا فرش ہر شجر کے تلے دھوپ چھاؤں کا

روشن تھیں فرش خاک پہ شمعیں جو دور دور | جلتا تھا نور دیکھ کے ان کا چراغ طور
شعلہ پری کا رخ تو دھواں مشک زلف حور | جاری تھے اشک گرم کہ افسردہ ہیں حضور
ہر چند گریہ کرنے کی پروانگی نہ تھی
پر ضبط ایسی آگ دلوں میں لگی نہ تھی

جب نصف کو گھٹے ہوئے لیلائے شب آئی | پردیس میں سادات پہ آفت عجب آئی
فریاد کناں روح امیر عرب آئی | غل تھا کہ شب قتل شہ تشنہ لب آئی
سادات کو کیا کیا غم جانکاہ دکھائے
رات ایسی مصیبت کی نہ اللہ دکھائے

کاغذ پہ لکھے کیا قلم اس شب کی سیاہی | ہے چار طرف جسکی سیاہی سے تباہی
مرغان ہوا رہیں تپاں بحر میں ماہی | تربت سے نکل آئے تھے محبوب الٰہی
فریاد کا تھا شور رسولان سلف میں
یثرب میں تزلزل تھا اداسی تھی نجف میں

تھی طرفہ شب تار کہ تارے بھی تھے مستور | اک پارہ تھی جسکا شب یلدا شب دیجور
دوڑے کہیں شبدیز نظر تھا نہ یہ مقدور | ہوتا نہ تھا ثابت کوئی نزدیک ہے یا دور

حضرت پہ وہ اُس تین پہر رات میں گذری
تکلیف سکندر پہ جو ظلمات میں گذری

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں
تھرّاتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دھڑکا تھا کہ وحشت سے نہ جانیں کہیں جائیں
روتی تھیں کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں
گودوں میں بھی راحت نہ کہیں پاتے تھے بچے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچے

تھا خانۂ غم خیمۂ شاہنشہ والا
آندھی یہ پریشاں تھی کہ دل تھا تہ و بالا
مشعل نہ ٹھہرتی تھی نہ شمعوں کا اُجالا
خیمہ بھی اندھیرے میں نظر آتا تھا کالا
خاک اُڑتی تھی منھ پہ حرم شیر خدا کے
تھا چین نہ جنبش فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے

گرمی

وہ لو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اُڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

آب رواں سے منھ نہ اٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردم تھے سات پردوں کے عرق میں تر
خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار
ایک ایک نخل جل رہا تھا صورت چنار

ہنستا تھا کوئی گل نہ لہکتا تھا سبزہ زار　　کانٹا ہوئی تھی پھول کی ہر شاخ باردار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے　　آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے　　گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں　　انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں　　تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو موجِ سیخ تک آئی کباب تھی

آئینہ فلک کو نہ تھی تاب تب کی تاب　　چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب　　کافورِ صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل تھے جمع سب کرۂ زمہریر میں

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت　　پانی نہ منزلوں کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں غازیوں کے رخت　　سنولا گئے ہیں رنگ جوانانِ نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے ہیں
تونسے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر　　صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنجِ مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر　　لب برگِ گل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر

آتی ہے خاک اُڑ کے یہیں دلیبار سے
گیسوے مشکبار اٹے ہیں غبار سے

اہلِ حرم ہیں ہودجِ محمل میں بے قرار
معصوم پانی مانگتے ہیں رو کے بار بار
بانو پکارتی ہے کہ اے شاہِ نامدار
گرمی سے جاں بلب ہے مرا لال شیر خوار
کیونکر یہ دکھ اٹھے چھ مہینے کی جان سے
گرمی ہے یا برستی ہے آگ آسمان سے

چلاتی ہے سکینہ کہ لیجے مرے چچا
محمل میں گھٹ گئی مجھے گودی میں لو ذرا
بابا سے کہدو اب کہیں خیمہ کریں بپا
ٹھنڈی ہوائیں لیجئے چلو تم پہ میں فدا
سایہ کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ آب ہے
تم تو ہوا میں ہو مری حالت خراب ہے

مخفی تھے شر رشدتِ گرما سے حجر میں
چلتی تھی یہ لو آگ بھڑکتی تھی جگر میں
نہ بحر میں راحت تھی کسی دل کو نہ بر میں
جھیلوں میں نہ پانی تھا نہ تپے تھے شجر میں
پایاب تھے گرمی سے وہ دریا جو بڑے تھے
سوتیں بھی نہ آتی تھیں کنوئیں خشک پڑے تھے

پتھر کی چٹانوں سے نکلتے تھے شرارے
ناری تھی ہوا سبز شجر زرد تھے سارے
ڈوبے تھے عرق میں اسد اللہ کے پیارے
دھڑکا تھا کہ لو کسی بچے کو نہ مارے
ہوش آتا نہ تھا اصغرِ معصوم کو غش سے
اودے تھے لبِ لعل سکینہ کے عطش سے

تھا مہر کی حدت سے یہ حال شہِ ابرار
ماتھے سے ٹپکتا تھا عرق سُرخ تھے رخسار
تحمید میں جنباں تھے لبِ لعل گہر بار
کبھر کہ نفس سرد یہ فرماتے تھے ہر بار

ایک پھول بھی زہرا کے چمن میں نہ ملے گا
کیا ہوگا جو پانی کسی بن میں نہ ملے گا۔

گرمی سے یہ تھا حضرت عباسؑ کا عالم — منھ سرخ تھا اور ہانپتے تھے صورت ضیغم
چہرہ بھی عرقناک تھا اور طبع بھی برہم — فرماتے تھے اشک آنکھوں میں بھر کر شہ عالم
تم شیر ہو راحت تمہیں بھائی نہ ملے گی
جب تک کسی دریا کی ترائی نہ ملے گی

یوں اکبر مہ رو تھے پسینے میں نہائے — جیسے تپ محرق میں جواں کو عرق آئے
جب بھکنے لگا دل تو سخن لب پہ یہ لائے — رب دو جہاں حشر کی گرمی سے بچائے
گزریگا ہر اک دم تپش دل سے قلق میں
سب تا بہ کمر ڈوبے ہوئے ہوں گے عرق میں

حضرت کو سکینہ بھی صدا دیتی تھی پیہم — محمل میں گھٹا جاتا ہے گرمی سے مرا دم
سب ڈوب گئی ہوں یہ پسینے کا ہے عالم — برسے گی یونہی آگ تو جینے کے نہیں ہم
ہیں ابر کرم آپ کرم کیجیے بابا
سایہ کہیں مل جائے تو دم لیجیے بابا

سُنکر یہ بھتیجی کی صدا حضرت عباسؑ — کہتے تھے چچا صدقے ہو روؤ نہ لبلد یاس
لو پانی پیو تم کو لگی ہو جو بہت پیاس — دم گھٹتا ہے محمل میں تو آجاؤ مرے پاس
تکلیف تمہاری ہمیں منظور نہیں ہے
دن ڈھلتا ہے منزل بھی بس اب دور نہیں ہے

مشکیں لئے سقے جو سواری کے تھے ہمراہ — بھر لاتے تھے پانی پئے فوج شہ ذی جاہ
جسطرح پیاسوں کا ہو مجمع بہ سر راہ — پانی پہ گرے پڑتے تھے یوں تشنہ کے ہو خواہ
جنگل میں عطش کا جو صدمہ کہ دہرہ پہ — چہرے پہ چھڑکتا تھا کوئی کوئی زرہ پر

بھرتا تھا دم سردِ پریشاں کوئی ہو کے — دامن سے ہوا دیتا تھا منہ کو کوئی دھو کے
بچتا تھا کوئی لو سے رواچہرے پہ رو کے — رکھ لیتا تھا سر پہ کوئی رومال بھگو کے
پڑھتے تھے جو چھینٹے تو مزا دیتا تھا پانی
جھک کر کوئی چلو ہی سے پی لیتا تھا پانی

غرض وہ خاص وصف جس نے میر صاحب کے مرثیوں کا پایہ بلند کیا اور اُن کو شعرا کی صفِ اول میں جگہ دلائی اُن کی مصوری اور واقعہ نگاری تھی جسقدر زیادہ مطالعہ اُن کے کلام کا کیا جائے گا اتنی ہی زیادہ تصدیق اس دعوے کی ہوتی جائے گی۔

رزمیہ شاعری بھی دراصل واقعہ نگاری کی ایک قسم ہے اس لئے یہاں بھی میر انیس اپنے ہم عصروں سے گوشے سبقت لے جاتے ہیں معرکہ کا زور شور۔ جنگ کا ہنگامہ۔ فوج کا ساز و سامان۔ سپاہیوں کا جوش۔ دشمن کی ابتری لشکر اعدا میں ہلچل۔ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے والوں کے کلیجے دہل جائیں حریفوں کے داؤں پیچ اور فنون جنگ کا یوں نقشہ کھینچتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے تصویر پھر جائے۔ نو عمری میں بانک بنوٹ وغیرہ فنون سپہ گری کی مشق کی تھی اُس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

یہ کہکے اپنے چھوٹے سے نیزہ کو دی تکاں — چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں
اک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں — ڈانڈا آئی ڈانڈ پہ تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

جھنجھلا کے چوب نیزے کو لایا وہ فرق پر — قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ ماری بچا کے سر
دو انگلیوں میں نیزہ دشمن کو تھام کر — جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر

نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفکار کا

بالائے سر جو ڈانڈ کو لایا وہ خود پسند
کھولے تمام نیزۂ بیدادگر کے بند
پھینکی شقی نے فرق پہ جھنجھلا کے پھر کمند
سر کو بچا کے شیر نے تلوار کی بلند
گردش بھی ہاتھ کی نہ بڑھے کچھ نہ ہٹ گئے
حلقے کھلے تھے جو وہ اشارے میں کٹ گئے

جناب عونؑ و محمدؑ سے مقابلے کے لئے دو زبردست پہلوان لشکر دشمن سے آتے ہیں۔ اب حریفوں کے داؤں پیچ دیکھئے۔ یہ تصویر کشتی کا کمال ہے۔

بائیں طرف وہ لاتے تھے جب پھیر کر سمند
مڑتے تھے دہنی سمت کو دونوں یہ ارجمند
آتے تھے زد پہ سامنے جب وہ جفا پسند
جاتے تھے اُڑ کے یاں سے بھی اسپاں سربلند
چوٹیں جو چل رہی تھیں ذرا فرق دہن سے
ڈھالوں پہ وار رک رہے تھے جا بنیں سے

آئے ادھر یہ جس سے وہ زن سے نکل گئے
وہ دب گئے یہ تول کے تیغیں سنبھل گئے
گھوڑے اُٹھا کے جب یہ گئے بر محل گئے
ظالم جہاں پہ تھم گئے سو وار چل گئے
غل تھا کہ ان کے ہاتھوں کی ضربیں بلا کی ہیں
چوٹیں یہ سب بندھی ہوئی مشکلکشا کی ہیں

پڑتی تھیں ان کے ہاتھ کی چوٹیں جو بار بار
غصہ میں آ کے اور جھپٹتے تھے نابکار
کیا ضربتیں جو مثل یداللہ نامدار
پنجوں سے تیغیں چھٹ گئیں گریں دو پرے کے پار
بچوں کے ہاتھ دہنے پہ جا کر جو پھر پڑے
سر کٹ کے دونوں خیمہ کی ڈیوڑھی پہ گر پڑے

معرکہ جنگ کا زور شور اس طرح بیان ہوتا ہے۔

جنگ

نکلی جو رن میں تیغ حسینی غلاف سے (١) اڑنے لگے شرر دمِ خارا شگاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشتِ مصاف سے صاف آئی الاماں کی صدا کوہ قاف سے
طبقے فلک کے صورت گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن سے مل گئے

راحت میں جن و انس و ملک کے خلل پڑے (٢) قلزم میں ڈر کے مردمِ آبی اچھل پڑے
کھا کھا کے جوش خاک سے چشمے ابل پڑے بیر الالم سے غول جنوں کے نکل پڑے
شہ کا غضب نمونۂ قہرِ آلہ تھا
تلوار کیا علم تھی کہ عالم تباہ تھا

اٹھا جو الحفیظ کا روحانیوں میں شور (٣) مر دے دہل کے چونک پڑے سب میان گور
چلائے گرگ شیر و غزالان و مار و مور ہے بازوئے حسین میں دستِ خدا کا زور
اُلٹے ہیں مثلِ شیر خدا آستین کو
اے کردگار عرش بچا لے زمین کو

چلّوں سے کج تہادلانے لگے خدنگ (٤) مُنہ زہ کشوں نے کھول دیے صورت نہنگ
خنجر رکھے کمر میں دو دھارے چٹا کے سنگ برچھی ہلا کے فوج نے جولاں کیے سرنگ
سرہنگ شام گرز گراں تولنے لگے
بڑھ بڑھ کے بیرقوں کو عدو کھولنے لگے

کالے علم نشان سیہ کالی سب سپاہ گویا زمیں کے سینے سے اٹھتا تھا دود آہ
تھا نالہ نفیر کہ ہے کس کو دو پناہ شہنا کی یہ صدا تھی کہ سید ہے بے گناہ
سُن کر دہل کا شور کلیجے دہلتے تھے
زہرا کے مہ لقا بھی کفِ افسوس ملتے تھے

وہ غول مصریوں کے وہ دل شام وروم کے (۶) آندھی سیہ اٹھی کہ گھٹا آئی جھوم کے
تنہا حسین بیچ میں تھا اس ہجوم کے　　تلوار لی نیام سے قبضہ کو چوم کے
اٹھا سخی کا ہاتھ یداللہ کی شان سے
نکلا ہمائے اوجِ شرف آسمان سے

باہر ہوئی نیام سے شمشیر شعلہ بار (۷) یا ابر سے نکل کے ہوئی برق بے قرار
یا کینچلی کو جھاڑ کے نکلا سیاہ مار　　یا آستین سے یدِ بیضا تھا آشکار
نکلی عروسِ فتح محافہ جدا ہوا
یا نامہ ظفر سے لفافہ جدا ہوا

کاٹھی تھی ذوالفقار کی یا تھا اجل کا گھر (۸) حجلہ تھا یا نقاب رخ لیلیٰ ظفر
گھونگھٹ اٹھا کے برق چمکی ادھر ادھر　　دلھا دلھن حجاب سے نکلے جھکائے سر
دکھلائی سب کو منہ کی صفائی لڑائی میں
جانیں ہزار روجہ سے لیں رونمائی میں

نکلی وہ جانگداز عجب زرق برق سے (۹) صاف آئی الحفیظ کی آواز برق سے
چشمک یہ دمبدم تھی ہر اک اہل شرق سے　　آتی ہوں میں سروں پہ ذرا فرق فرق سے
دریائے قہر حضرتِ پروردگار ہوں
طوفان اٹھیگا یاں سے میں وہ ذوالفقار ہوں

الٹے تھے آستیں جو شہنشاہ سرفراز (۱۰) جنباں تھی کربلا کی زمیں صورت جہاز
اعدا کی فوج پہ تھی زباں تیغ کی دراز　　کہتے تھے کانپ کانپ کے آپس میں فتنہ ساز
کیونکر جواب دے کوئی دم بند سب کے ہیں
غل تھا کہ ذوالفقار کے فقرے غضب کے ہیں

کوندی جو برق طاقت گفتار گھٹ گئی (۱۱) جو صف پئے مقابلہ بڑھی تھی وہ ہٹ گئی

ثابت ہوا ہر اک پہ کہ دنیا الٹ گئی   آ پہونچی تھی یہ ڈر کے قیامت پلٹ گئی
پھر حشر تھا جو رحم نہ آئے حضور کو
منھ سے ملا چکے تھے سرافیل صور کو

چلتی تھی ذوالفقار جو بن بن ادھر ادھر (۱۲) دہشت سے چھپتے جاتے تھے دشمن ادھر ادھر
کٹ کٹ کے گر رہے تھے سر و تن ادھر ادھر   ٹکڑے پڑے تھے خاک پہ جوشن ادھر ادھر
ڈر کر کے جو سوار گرے وہ مرے گرے
صف پر گری جو صف تو پرے دل پر پرے گرے

رویں تنوں کے جسم کے ٹکڑے اڑا دیئے (۱۳) ہاتھوں کے کاٹ کاٹ کے پرزے اڑا دیئے
گردن بچی کسی کی تو شانے اڑا دیئے   پہونچا جو سر پہ ہاتھ تو پہونچے اڑا دیئے
اوچھا بھی وار گر کسی دشمن کے لگ گیا
تن جا رہا تڑپ کے الگ، سر الگ گیا

سر سے جدا تھا خود تو سر تھے جبیں سے دور (۱۴) قبضوں سے قبضیں دور تھیں ہاتھ آستیں سے دور
جاں جسم سے تو جسم تھے جانِ حزیں سے دور   کارہ مکیں مکاں سے مکاں تھے مکیں سے دور
اس تیغ جانستاں سے فقط سر قلم نہ تھے
اللہ رے تفرقہ کہ عناصر بہم نہ تھے

جب وہ بلند ہوتی تھی مانند ماہِ نو (۱۵) جاتی تھی دور دور بیاباں میں اسکی ضو
اسکی نہ ایک ضرب نہ اعدا کے وار سو   کشتِ حیات اہل ستم ہو گئی درو
سرکش سب اک دم میں نگونسار ہو گئے
کٹ کر سروں کے کھیت میں انبار ہو گئے

کیا لشکر یزید پہ رنج و محن پڑا (۱۶) طالع جو نحس تھے تو انھیں پہ گہن پڑا
لاشے پہ لاشہ سر پہ سر اور تن پہ تن پڑا   کہتی تھی موت بھی کہ قیامت کا رن پڑا

اوپر تلے جو کشتوں کے انبار پاتی تھی
گنتی کو بار بار اجل بھول جاتی تھی

کشتے تڑپ رہے تھے برابر زمین پر (۱۷) زندے تھے خوف قتل سے مضطر زمین پر
آئی جو سن سے تیغ دو پیکر زمین پر گردوں نے دھڑ سے پھینک دیا سر زمین پر
سلطان دیں کے پاؤں پہ سر ٹک کے گر پڑا
تن مارے ڈر کے چند قدم ہٹ کے گر پڑا

جرّے بھی قتل گاہ سے منہ موڑنے لگے (۱۸) ہٹ ہٹ کے پیچھے ہاتھ تبر جوڑنے لگے
ڈر ڈر کے مورچوں کو جری چھوڑنے لگے تیغیں ٹپک کے خاک پہ دم توڑنے لگے
چلاتی تھیں کمانیں کہ اب رخ کدھر کریں
ڈھالیں تھیں مضطرب کہ کسے ہم سپر کریں

ہر چند ساری فوج پہ ڈھالوں کی آڑ تھی (۱۹) بھاری تھی ضرب یہ کہ لڑائی پہاڑ تھی
غلبہ تھا دیں کا کفر کی بستی اجاڑ تھی میدان معرکہ میں عجب مار دھاڑ تھا
ڈر ڈر کے منہ سے زہر سبھوں نے اگل دیئے
گھوڑوں کے سم نے موذیوں کے سر کچل دیئے

سن سن چلی جو تیغ تو جی سن سنا گئے (۲۰) دریا کے چوکیدار لہو میں نہا گئے
دعویٰ تھا مردمی کا پہ آنکھیں چرا گئے بچ بچ کے آب تیغ کے چھینٹوں میں آ گئے
مٹی نے بھی عزیز نہ اُن کا لہو کیا
دم بھر میں ذوالفقار نے بے آبرو کیا

آفت تھی قہر تھی غضب ذوالجلال تھی (۲۱) بجلی تھی صاعقہ تھی فنا تھی زوال تھی
خنجر تھی نیمچہ تھی کٹاری تھی بھال تھی اعدا کے ذبح کو نیکو سمجھے حلال تھی
جیتا تو سامنے سے کوئی کم نکل گیا
منہ اُسکا جس نے دیکھ لیا دم نکل گیا

سر اڑ گئے تنوں سے جدھر سرسری چلی (۲۲) خشکی سے خوں میں ڈوب کے سوئے تری چلی
غازی ہوئے پرے تو غضب میں بھری چلی
غل تھا کہ لو دکھا کے لگاوٹ پری چلی

خنجر انھیں کے اُن کا لہو چاٹنے لگے
دیوانے آپ اپنا گلا کاٹنے لگے

چھوٹیں کمانیں قبضوں سے اور چٹکیوں سے تیر (۲۳) کیسی لڑائی سہمے ہوئے تھے جوان و پیر
غازی کلے تھے تیغ زن قدر انداز گوشہ گیر
اپنے لہو میں لوٹتے پھرتے تھے پھر شریر

لشکر سیہ یہ خوں کا جو پامال ہو گیا
مارے خوشی کے تیغ کا منھ لال ہو گیا

تلوار اور گھوڑے کی تعریف میں مرثیہ گویان لکھنؤ خصوصاً مرزا دبیر علیہ الرحمتہ نے قلم توڑ دیا تھا۔ اس میدان میں تعلّی اور مبالغہ کی حد باقی نہ رکھی تھی۔ گھوڑے کی سُرعت کی توصیف یہاں تک بڑھا دی تھی کہ "سن بڑھ نہیں سکتا"۔

(دبیر)
اس رخش کے منھ پر کوئی دن بڑھ نہیں سکتا
سُرعت کا یہ عالم ہے کہ سن بڑھ نہیں سکتا

اور تلوار کی شعلہ فشانی کا یہ عالم تھا کہ

تلواروں پر وہ سیف جو شعلہ فشاں ہوئی
جل بھُن گئے آب تیغوں کی لَن میں دھواں ہوئی

میر صاحب نے اس دشوار منزل کو بھی سلامت روی سے طے کیا۔ انتہائی مبالغہ کیا تو ساتھ کہیں کہیں اصلیت کی جھلک بھی نظر آ جاتی ہے اور وہی تصویر واقعہ اُن کے کلام کو دوسروں سے ممتاز کرتی، اور اندھیری رات میں جگنو کا کام دیتی ہے۔

تلوار

قد کتنا خوشنما ہے بدن کسقدر ہے گول (۱) جوہر شناس ہی تو اسے موتیوں میں تول
مضّاح فتح ہی در نصرت کو اس سے کھول   وہ تیغ ہی خراج صفاہاں ہی جسکا مول
اشراف کا بناؤ رئیسوں کی شان ہے
شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

دلسوز شعلہ خو شرر انداز جاں گداز (۲) لشکر کش و شکست رساں و ظفر نواز
خونخوار و کج ادا و دل آزار و سرفراز   حاضر جواب تیز طبیعت زباں دراز
پر اسکی ہے پسند جہاں گو سبھی نہ ہو
معشوق کچھ نہیں ہے جو اتنی کجی نہ ہو

پشتہ وہ اسکا اور وہ باریکی خمیر (۳) کس بل میں بیمثال اصالت میں بےنظیر
جنگ آزما خراج ستانندہ ملک گیر   گیتی نورد بادیہ پیما فلک مسیر
اسکا جلال خلق میں کس پر جلی نہیں
کوچہ وہ کونسا ہے جہاں یہ چلی نہیں

چھوڑے اگر شعاع کی چلمن آفتاب (۴) کیا تاب ہے کہ لا سکے اسکی چمک کی تاب
آفت کا دم ہی قہر کی تیری غضب کی تاب   دشمن اسے جو رات کو دیکھے میان خواب
بھاگے ہزار وہ پہ نہ پاوے مفر کہیں
بستر پہ دھڑ کہیں ہو دم صبح سر کہیں

بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی (۵) ندی ادھر اک خوں کی اُبلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی   پی پی کے لہو لعل اگلتی ہوئی آئی
ہیرا تھا بدن رنگ زمرد سے ہرا تھا
جوہر جو کہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا

زیبا تھا دم جنگ پہ پوشش اُسے کہنا (٦) معشوق بنی سُرخ لباس اس نے جو پہنا
اس اوج پہ وہ سر کو جھکائے ہوئے رہنا
جوہر تھے کہ پہنے تھے دلہن پھولوں کا گہنا
سیب چمن خلد کی بو باس تھی پھل میں
رہتی تھی وہ شبیرؑ سے دولہا کی بغل میں

پہونچی جو سپر تک تو کلائی کو نہ چھوڑا (٧) ہر ہاتھ میں ثابت کسی گھائی کو نہ چھوڑا
شوخی کو شرارت کو لڑائی کو نہ چھوڑا
تیزی کو رکھائی کو صفائی کو نہ چھوڑا
اعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے
قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے

نوجوں کو دے جواب وہ تیری زباں میں (٨) ترکش میں چھپے تیر نہ ترکش کماں میں
پانی تھا نہ کہ آگ لگا دے جہاں میں
نازل ہوا تھا آیۂ برق اس کی شان میں
بے فتح پھیرتی تھی نہ منھ کارزار سے
دعوائے ہمدمی تھا اُسے ذوالفقار سے

کیا کیا چمک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے (٩) تنتی تھی کیا تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پیتے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے
دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے
کیا جانیے ملا تھا مزا کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

ہر ہاتھ میں اُڑا کے کلائی نکل گئی (١٠) کوندی گری زمیں میں سمائی نکل گئی
کاٹی زرہ دکھا کے صفائی نکل گئی
مچھلی تھی ایک دام میں آئی نکل گئی
چار آئینے کے پار تھی اس آب و تاب سے
جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے

پہونچی سم فرس پہ جو بالائے سر گری (١١) چمکی ادھر زمیں سے نکل کر ادھر گری

ناری چلے اُدھر وہ جدھر کوند کر گری   جس صف سے لگ چلی وہیں صف خاک پر گری
دکھلا کے اوج جاتی تھی وہ یوں سوار پر
جنگل میں باز گرتا ہے جیسے شکار پر

جب خود پہ بیٹھی تو چِلم کاٹ کر اُٹھی (۱۲) دستانہ کو مانند قلم کاٹ کر اُٹھی
جوشن پہ آئی تو شکم کاٹ کر اُٹھی   سر پر جو پڑی تا بہ قدم کاٹ کر اُٹھی
بالا تھی وہ شمشیر ستمگار فرد تھا
دیکھا تو فرس بھی اسی اک ضرب میں دو تھا

جب آئی سن سے کاٹ کے جوشن نکل گئی (۱۳) اژدر صفوں کے بیچ میں ناگن نکل گئی
یوں چاک کر کے سینۂ دشمن نکل گئی   شہ رگ سے جاں صدر سے گردن نکل گئی
سالم رگیں جسم کی نہ استخواں رہے
ٹوٹے قفس میں طائر وحشی کہاں رہے

پھول اڑ گئے پھل اسکا جو چمکا سپر کے پاس (۱۴) نکلی ادھر سپر سے کہ آ پہونچی سر کے پاس
سر سے اتر گئی دل بیداد گر کے پاس   دل سے جگر کے پاس جگر سے کمر کے پاس
کھولا کمر کا بند تو در آئی زین میں
زیں سے گئی فرس میں فرس سے زمین میں

چم خم وہ تیغ کا وہ لگاوٹ وہ آب و تاب (۱۵) آتش کسی جگہ کہیں بجلی کہیں سحاب
سیلی تھی ایک پری کے شکم پہ گرہ اسکی ناف   تیزی زباں پہ وہ کہ فرشتوں کو دے جواب
جوہر سے اسکا جسم جواہر نگار تھا
گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

پیاسی بھی خون فوج کی اور آبدار بھی (۱۶) غل تھا کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی نار بھی
بجلی بھی ابر تر بھی خزاں بھی بہار بھی   تلوار بھی سپر بھی چھری بھی کٹار بھی

پانی نے اسکے آگ لگا دی زمانے میں
اک آفت جہاں تھی لگانے بجھانے میں

ہم چشم تھا ابرو سے حسینوں کی خم اسکا (۱۷) اللہ ری چمک برق بھی بھرتی تھی دم اسکا
ناگن تھی اترتا ہی نہ تھا چڑھکے سم اسکا
ہر ہاتھ میں ہاتھ اسکا تو بازو قلم اسکا
جوہر کی چمک دیکھی نہ ہیرے کے نگوں میں
یوں دوڑتی تھی تن میں لہو جیسے رگوں میں

آمد تھی تیغ کی کہ اجل کا پیام تھا (۱۸) یہ صف اخیر تھی وہ رسالہ تمام تھا
بجلی سا ہر جگہ فرس تیز گام تھا
ششدر تھی موت چار طرف قتل عام تھا
اس غول پہ کبھی تھی کبھی اس قطار پہ
پڑتا تھا ایک تیغ کا سایہ ہزار پہ

منہ پھر گئے سپاہ کے جس سمت رخ کیا (۱۹) یاں سے وہاں گئی اسے مارا اسے لیا
باقی رہے ہزار میں تو دس میں اک جیا
اللہ رے دم لہو پہ لہو تیغ نے پیا
اسپر بھی تشنگی میں نہ تسکین ذری ہوئی
گویا تھی آگ پیٹ میں اسکے بھری ہوئی

جب سن سے فوج کفر پہ وہ جنگجو چلی (۲۰) گویا سموم قہر خدا چار سو چلی
بسمل پھڑک کے رہ گئے یوں تند خو چلی
ٹکڑے اڑائے ذبح کیا سرخرو چلی
غل تھا برش ہے قہر کی جوہر بلا کے ہیں
دم بھر میں فیصلہ یہ کرشمے قضا کے ہیں

جسکے گلے میں مل کے چلی مر کے رہ گیا
بسمل بھی تیغ تیز کا دم بھر کے رہ گیا
آگے بڑھا کوئی تو کوئی ڈر کے رہ گیا
سکتے میں کوئی منہ پہ نظر کر کے رہ گیا
دو پتلیاں بھی بہر تماشا تلی رہیں
مرکٹ کے گر پڑا مگر آنکھیں کھلی رہیں

چھپتی تھی برق اس کی چمک دیکھ دیکھ کے (۲۲) رہ جاتے تھے سماک و سمک دیکھ دیکھ کے
تھرّاتا تھا زمیں کو فلک دیکھ دیکھ کے خورشید کانپتا تھا جھلک دیکھ دیکھ کے

جوہر میں پیچ و تاب تھا زلفوں کے جال کا
بجلی کی زرق برق تھی چم خم ہلال کا

جو دشمنِ دیں تھا اسے پہچانتی تھی وہ (۲۳) مغفر کو حبابِ لبِ جو جانتی تھی وہ
چار آئینۂ خود کو کب مانتی تھی وہ ہر وار میں جوشن کا جگر چھانتی تھی وہ

اژدر تھا کہ تلوار تھی دم تھا کہ ستم تھا
ناہیں تھیں کہ گھر موت کا پانی تھا کہ سم تھا

مشہور تھی وہ رشکِ پری قاف سے تا قاف (۲۴) جوہر تھا جواہر کا کہ تھا زیور شفاف
سر سے گئی تا صدر شکم سے گئی تا ناف پھر دیکھو تو لب خشک زباں پاک دہن

ٹپکا جو لہو منہ سے شرارے نظر آئے
دریا سے گھر ابر سے تارے نظر آئے

بڑھ کر کسی نے وار جو روکا سپر کٹی (۲۵) چار آئینہ کٹا زرہ خیرہ سر کٹی
نیزہ کی ہر گرہ صفتِ نیشکر کٹی سینہ کٹا جگر ہوا زخمی کمر کٹی

دہوار بھی دو نیم میان مصاف تھا
ان سب کے بعد منہ کو جو دیکھا تو صاف تھا

چمکی گری اٹھی ادھر آئی ادھر گئی (۲۶) خالی کئے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئیں
کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی

اک شور تھا یہ کیا ہے جو قہر صمد نہیں
ایسا تو رود نیل میں بھی جزر و مد نہیں

سو سو ہوئے بے سر صفِ دشمن پہ جب آئی (۲۷) غل تھا نہیں بچنے کے اجل سب کی اب آئی

اتنی تو صدا آئی کہ برقِ غضب آئی پھر یہ نہ کھلا کب گئی اور سر پہ کب آئی
افتادہ تھے بے سر جو پرے فوجِ لعین کے
سطریں سی نظر آتی تھیں صفحے پہ زمین کے

دکھلا کے گلِ زخم بدن سے نکل آئی (۲۸) شمشیر خزاں تھی کہ چمن سے نکل آئی
ہمراہ لئے روح کو تن سے نکل آئی شپ سے جو پڑی سر پہ تو تن سے نکل آئی
سرکش کا تکبّر سے جب افلاک پہ سر تھا
جھپکی تھی ادھر آنکھ ادھر خاک پہ سر تھا

مغفر میں ہوئی غرق تو سر کاٹ کے نکلی (۲۹) روکا جو سپر پر تو سپر کاٹ کے نکلی
شانے پہ گری تا بہ کمر کاٹ کے نکلی سینے میں در آئی تو جگر کاٹ کے نکلی
ہر ہاتھ میں گردش تھی نئی ڈھنگ نیا تھا
گھوڑے کے بھی ٹکڑے تھے یہ جو رنگ نیا تھا

کٹ جاتے تھے منھ دیکھ کے سب تیغ زن اسکا (۳۰) قامت میں کجی چال میں وہ بانکپن اسکا
ناریک زمیں اور وہ تاباں بدن اس کا چلتی تھی سروں پر یہ نیا تھا چلن اسکا
بجلی کو بھی تڑپا دیا تھا جلوہ گری نے
ناب اسکی تھی یا مانگ نکالی تھی پری نے

اک آگ سی تھی چار طرف شعلہ فشاں برق (۳۱) وہ برق کہ خود مانگتی تھی جس سے اماں برق
یاں موج تو واں سیل جو یاں برق تو واں برق منھ زہر برش قہر بدن آگ زباں برق
سرکش تھا جو ناری یہ جلاتی تھی اسی کو
ہے ہے یہ جو گرتی تھی تو کھاتی تھی اسی کو

اٹھکی کبھی ٹھہری کبھی لچکی کبھی چمکی (۳۲) سر گر گئے گردن جدھر اس تیغ نے خم کی
سیدھی صفِ دشمن کو ملی راہ عدم کی سیفی تھی کہ گویا دمِ شمشیر پہ دم کی

دم بھر میں صفیں صاف تھیں بیداد گروں کی
تھی مینھ کی طرح خاک پہ بوچھار سروں کی

مغفر سے چھلم کاٹ کے گردن میں در آئی (۴۳) گردن سے کٹا سر کہ وہ جوشن میں در آئی
جوشن سے گذرنا تھا کہ بس تن میں در آئی — تن سے ابھی اتری تھی کہ توسن میں در آئی
بچتا کوئی کیا تیغ قضا رنگ کے نیچے
اک برق غضب کوند گئی تنگ کے نیچے

دم بھر نہ ٹھہرتی تھی عجب طرح کا دم تھا (۴۴) نیزے پہ جسے ناز تھا سر اس کا قلم تھا
ناگن میں نہ یہ زہر نہ افعی میں یہ سم تھا — یہ فتح کی جویا تھی قد اسواسطے خم تھا
بد اصل تکبر سے سخن کہتے ہیں اکثر
جو صاحب جوہر ہیں جھکے رہتے ہیں اکثر

کاٹھی سے اسطرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا (۴۵) جیسے کنار شوق سے ہو خوبرو جدا
مہتاب سے شعاع جدا گل سے بو جدا — سینے سے دم جدا رگ جاں سے گلو جدا
گرجا جو رعد ابر سے بجلی نکل پڑی
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلی نکل پڑی

گھوڑا

خوش شہرو خوش خرام و خوش انداز و خوش لجام — خوش خو و خوش جمال و ادا فہم و تیز گام
جاندار و شوخ چشم و سعید و خجستہ گام — گل پوش و تیز ہوش دشمن گوش و لالہ فام
غازی تھا سرفراز تھا عالی دماغ تھا
گویا ہوا کے دوش پہ اک زندہ باغ تھا

اس صف کو الٹ کر ادھر آیا ادھر آیا — فوجوں سے پلٹ کر ادھر آیا ادھر آیا
بجلی سا سمٹ کر ادھر آیا ادھر آیا — جوں شیر جھپٹ کر ادھر آیا ادھر آیا

تھمتا تھا چھلاوہ بھی مگر یہ نہیں تھمتا
طائر بھی ٹھہر جاتا ہے پر یہ نہیں تھمتا

جو رگ ہے عوض خون کے سرعت سے بھری ہے | جلدی جو ہے سب جلد بھی جودت سے بھری ہے
شعلے کی طرح طبع شرارت سے بھری ہے | اُبلی ہوئی ہر آنکھ شجاعت سے بھری ہے
اڑ جاتا تھا یہ چھوں وہ محل جست کا پا کے
تلواروں کے نیچے سے نکل جاتا تھا آ کے

صرصر تھا کبھی گاہ نسیم سحری تھا | طاؤس فلک سیر دم جلوہ گری تھا
بن ٹھنکے اٹھانے میں قدم کبک دری تھا | کاوے میں جو پرکار تو اڑنے میں پری تھا
رفتار نہ تو کب اپنی دکھاتا تھا کسی کو
سایہ بھی نہ اسکا نظر آتا تھا کسی کو

وہ شہسوار اور وہ سمند فلک نورد | پائی کبھی صبا نے نہ جسکے قدم کی گرد
بازار برق گرم روانی سے اسکی سرد | تھا چال میں پری تو چھلاوہ دم نبرد
اسکی سبک روی سے خجالت سحاب کو
دریا پہ جائے اور نہ خبر ہو حباب کو

صرصر سے تیز تر تھا وہ اسپ خجستہ فر | یکساں تھا اسکو عنصر خورشید دشت و در
پانی پہ تھا جو موج تو آتش میں تھا شرر | گیتی نورد برق تگ آسمان سفر
ٹاپوں سے سرکشوں کی صفیں پائمال تھیں
زیں آفتاب تھا تو رکابیں ہلال تھیں

مشرق سے جو رکب سے ہاں کہہ کے اُڑا دے | عقل حکما دنگ ہو سرعت وہ دکھا دے
ہے الف ہاں ابھی یاں وصل نہ پائے | مغرب سے یہ خورشید فلک جا کے پھر آئے
دھوکا پر پرواز کا ہے دامن زیں پر | طاؤس ہوا پر ہے تو بجلی ہے زمیں پر

یہ تا حدِ امکاں صفتِ عقل رسا جائے
بالائے فلک صورتِ شبدیزِ دعا جائے
کہسار سے دریا کی طرف مثلِ ہوا جائے
دریا پہ جو دوڑاؤ تو مانندِ ہوا جائے
سیر اسکی اگر چشم کو منظورِ نظر ہو
آنکھوں میں پھرے یوں کہ نہ پتلی کو خبر ہو

اڑ جانے میں رنگِ رخِ عاشق سے سبک تیز
کاکل کہ وہ زلفِ سرِ لیلیٰ سے دلآویز
پوئی میں غزالوں کے طراروں سے کہیں تیز
آقا کے ارادے کو سمجھتا ہے وہ مہمیز
جوں سایۂ آہو نہ قرار اس کو کہیں تھا
راکب نے جدھر آنکھ سے دیکھا یہ وہیں تھا

جرأت میں نہنگ شیر تو ہیکل میں پیل تن
پوئی کبھو تو کبکِ دری جست میں ہرن
بجلی کسی جگہ تو کہیں ابرِ قطرہ زن
بن بن کے آنے جانے میں طاؤس کا چلن
سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

آنکھیں وہ جنکو دیکھ کے حیراں رہے غزال
گردن وہ جس کی شرم سے ہے سرنگوں ہلال
آہو کی جست شیر کی جھپٹ پری کی چال
دل اسکے دست و پائے حنائی سے پائمال
ہر نعل پا کا حسن پہ تھا اس جلوس میں
آئینہ جس طرح سے ہو دستِ عروس میں

کل کی طرح اشارے میں سو بار پھیر لو
بجلی ہے جس طرف دمِ پیکار پھیر لو
کاوے میں شکلِ گنبدِ دوّار پھیر لو
نقطے کے گرد صورتِ پرکار پھیر لو
دوڑے بڑھے آب تو پتلی بھی تیز نہ ہو
آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

ضیغم کی جو تھی جست تو آہو کے طرارے
آنکھوں کو چھپاتے تھے غزالان بیچارے

ہر نعل سے خم تھا مہ نو شرم کے مارے   اٹھتے تھے قدم جب تو چمکتے تھے ستارے
ہو رشک نہ کیونکر فلک ماہ جبیں کو
نقش سم توسن سے لگے چاند زمیں کو

باریک جلد وہ کہ خجل قاقم و حریر   مشکیں پہ ند آہوئے رم خوردہ شیر گیر
حلقے سے یوں نکل گیا جیسے کماں سے تیر   آتش مزاج بادیہ پیما فلک مسیر
یوں فتح ساتھ ساتھ تھی اس راہوار کے
جیسے پیادہ چلتا ہے آگے سوار کے

آمد فرس کی تھی دلہن آتی ہے جس طرح   تھم تھم کے نکہت چمن آتی ہے جس طرح
خوشبوئے نافہ ختن آتی ہے جس طرح   یا شمع سوئے انجمن آتی ہے جس طرح
باہم طیور کہتے تھے کبک دری ہے یہ
گھوڑے چراغ پا تھے کہ بےشک پری ہے یہ

چاروں سموں سے بدر خجل نعل سے ہلال   کھیلیں شکار شیر پہ آنکھیں ہیں وہ غزال
کھینچے نہ بال حور نے بکھرائے ہیں بال   پھرتے ہیں جھوم جھوم کے صدقے پری کی چال
رستے ہیں یاد گنبد نیلی رواق کے
دلدل کی تیزیاں ہیں طرارے براق کے

سینہ کشادہ تنگ کمر چست جوڑ بند   گردن خم ہلال اور اس پہ سر بلند
جاندار برد بار عدو کش ظفر پسند   بجلی کبھی جگہ کبھی آہو کبھی پرند
سرعت ہے ابر کی تو لطافت ہوا کی ہے
اتنے ہنر فرس میں یہ قدرت خدا کی ہے

وہ زیب زین زین کی وہ ساز وہ پھبن   زیور سے جیسے ہوتی ہے آراستہ دلہن
چشم سیاہ دیدۂ آہو پہ طعنہ زن   سرعت یہ تھی کہ بھولتے تھے چوکڑی ہرن

جادو تھا معجزہ تھا پری تھا طلسم تھا
پاکھر نہ تھی زرہ میں تہمتن کا جسم تھا

وہ صاف صاف اس کی گنوتی کہ کفل
اللہ رے کشادگی سینہ و بغل
سیماب کی طرح نہیں آرام ایک پل
پھرتا تھا اسطرح کہ پھرے جس طرح سے کل
راکب نے سانس لی تو وہ کوسوں رواں نہ تھا
تارِ نفس بھی اسکے لئے تازیانہ تھا

وہ جست خیز اور وہ چالاکی سمند
سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اسکے جوڑ بند
سم قرص ماہتاب سے روشن ہزار چند
نازک مزاج و تندخو و سیہ چشم و سر بلند
گر ہل گئی ہوا سے ذرا باگ اڑ گیا
پتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مڑ گیا

آہو کی جست شیر کی آمد پری کی چال
کبک دری خجل دل طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی سے قدم کے تلے نہال
اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال
جو آ گیا قدم کے تلے گرد برد تھا
چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا کبھی رہوار بن گیا
آیا عرق تو ابر گہر بار بن گیا
گہ قطب گاہ گنبد دوار بن گیا
نقطہ کبھی بنا کبھی پرکار بن گیا
حیراں تھے اسکے گشت پہ لوگ اس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

سمٹا جما اڑا ادھر آیا ادھر گیا
چمکا پھر اچھال دکھایا ٹھہر گیا
تیروں سے اڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا
برہم کیا صفوں کو پرے سے گذر گیا

گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اسکی فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

افزوں ہجر زلف حور سے خوشبو ایال کی | دیکھیں تو لیں بلائیں سدا بال بال کی
پریاں خرام ناز میں شاگرد چال کی | غصہ میں جست شیر کی شوخی غزال کی

وہ حسن تن پہ ساز کا جوبن براق کا
دلدل کے ہاتھ پاؤں تو چہرہ براق کا

میر صاحب کے کلام پر ریویو نامکمل رہے گا اگر ان کی نازک تشبیہات ولطیف استعارات کی مثالیں نہ پیش کی جائیں۔ گلشن کی ایک ایک کلی میں معشوق کا جلوہ دیکھنا اور محبوب کے ایک ایک خال وخط پہ کائنات کو فدا کرنا شاعر کا خاص کام ہے کم سے کم متاخرین شعرائے فارس نے تو اسی جادو نگاری کی بدولت بقائے دوام کے دربار میں جگہ پائی ہے۔

شعرا کی زبان میں معشوق کی آنکھ پر چشم غزالاں صدقے ہے رخسار سے شمس وقمر خجل ہیں۔ گلاب کی پنکھڑی لب نازک کی مثال ہے۔ دانت موتی کو شرمندہ کرتے ہیں۔ گردن صراحی دار ہے۔ ذقن سیب ہے۔ قامت سرو شمشاد ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ دل آویز تشبیہیں جن سے شعرائے اردو کے دواوین رنگین ہیں۔ معشوقان بازاری کا سراپا بیان کرنے کے لئے بہت مناسب ہیں۔ لیکن "ہم شکل مصطفےٰ" اور "پسر حیدر صفدر" کے خط وخال کا ان پیش پا افتادہ مضامین سے نقشہ کھینچنا ایک عاشق اہل بیت عجز شاعری سمجھتا ہے۔ وہ ان کے سراپا کی توصیف کے لئے نئی نئی تشبیہیں تلاش کر کے لاتا اور اپنی معجز بیانی کا جلوہ دکھاتا ہے۔

سراپا

استادہ ہے یہ ماہ بنی ہاشم ذی قدر — دکھلائیے تو اس شکل و شمائل کا کوئی بدر
یہ دوش یہ بازو یہ گلو یہ کمر و صدر — یہ عارض و گیسو سحر عید و شب قدر
یاں کونسی نسبت ہے تری شمس و قمر کو
اک رات کو قربان کروں ایک سحر کو

پیشانی پُر نور سے ہے رن میں اُجالا — روے و خط رخسار وہ مہتاب میں ہالا
ابرو ہے کہ سرتیز سرِ دہی کا ہے مالا — پلکیں نہیں جھپکیں پہ ہے لشکر تہ و بالا
دیکھے سے اُڑیں ہوش نہ کیوں اہل حسد کے
آنکھیں تو ہیں آہو کی یہ تیور ہیں اسد کے

جلتے ہیں یہ دیکھو نکہ نہ مہ و خور سحر و شام — ہے حسن کی آتش سے بھبھوکا رُخِ گلفام
اک شاخ ہے یا دو گل بادام ہیں اظہار — یا یہ الفِ ماہِ دو ہفتہ ہے ہنود دار
خوشبوئے گلستان ارم اس میں بھری ہے
گویا ورقِ زر پہ کلی گل کی دھری ہے

یا قوت لب سرخ ہیں دنداں دُرِ مکنوں — دیکھے سے عقیق جگری کا بھی ہے دل خوں
کس چیز سے نسبت دہن تنگ کو میں دوں — نایاب ہے عنقا کی طرح طائرِ مضموں
حال انکا نزاکت سے کُھلیگا نہ کُھلا ہے
یاں بابِ سخن بند ہی رکھئے تو بجا ہے

آتی ہے صدا صاف قلم سے دمِ ترقیم — ہے جوہر فرد اس کی نہ ہوگی کبھی تقسیم
بینی ہے الف زلف ہے لام اور دہن میم — جو عرف ہیں قرآن کا وہ لائق تعظیم
وصفِ دہن تنگ میں دقت مجھے کیا ہے
کافی ہے بس اتنا ہی کہ اسرار خدا ہے

آتی ہے ثنائے دُرِ دنداں جو زباں پر ۔۔۔ تقریر کے رشتے ہیں پروتا ہوئیں گوہر
ہیرے کے نگیں اُن سے ہوں کسطرح برابر ۔۔۔ یہ بحرِ شرافت کے ہیں موتی تو وہ پتھر
ہنسنے میں جو پڑ جاتا ہے عکس اُنکا فلک پر
بجلی بھی تڑپ جاتی ہے دانتوں کی چمک پر

دل کیسکا نہ گردن کی صفائی پہ ہو قرباں ۔۔۔ مہتاب کو ہے جسکے گلے ملنے کا ارماں
گویا کہ ہلالِ شبِ اوّل ہے گریباں ۔۔۔ شانوں کی نشانِ اسدِ حق ہے کیا شاں
حیراں تھی نظر دوشِ مبارک پہ گماں ہے
یاقوت میں خورشید جہانتاب عیاں ہے

ہیں بازوئے عباس کہ شاخِ شجرِ حسن ۔۔۔ پڑتی ہے سدا نور پہ جنکے نظرِ حسن
گھر حسن کا سینہ ہے تو بازو ہیں درِ حسن ۔۔۔ طالع ہے کفِ دست سے مہرِ سحرِ حسن
ان ہاتھوں سے بہتر کفِ حور نہیں ہے
خورشید کے پنجہ میں بھی یہ نور نہیں ہے

ہر چیز علمدار نے پائی ہے علی ع کی ۔۔۔ اللہ نے تصویر بنائی ہے علی کی
پنجہ ہے علی کا تو کلائی ہے علی کی ۔۔۔ ان انگلیوں میں عقدہ کشائی ہے علی کی
ورثہ میں ہے زور ان کو ملا جد و پدر سے
ہلکا در خیبر کو سمجھتے ہیں سپر سے

دیکھو تو کسی شیر نے پایا ہے یہ سینہ ۔۔۔ حصہ میں اسی چاند کے آیا ہے یہ سینہ
حق نے ید قدرت سے بنایا ہے یہ سینہ ۔۔۔ سینے سے ید اللہ نے لگایا ہے یہ سینہ
فرماتے ہیں عاشق ہوں میں اس رشک قمر کا
یہ سینہ سپر ہو دیگا زہرا کے پسر کا

ہے تابو دم ذہن رسا دوڑ کے جاتا ۔۔۔ لیکن کہیں مضمون کمر کو نہیں پاتا

ہے بالِ سیہ دُرِ نجف میں نظر آتا　　مثلِ رگِ گل تابِ نزاکت نہیں پاتا
اس رشتہ سے محکم کمر مرتضوی ہے
نازک تو ہے پر دین کی پشت اس سے قوی ہے

شمشاد سے بالا قدِ بالائے مبارک　　درپیش ہے اب وصف قدمہائے مبارک
تعویذِ شفا نقش کفِ پائے مبارک　　جس جا گذران کا ہو وہ ہے جائے مبارک
واں آتے ہیں سجدے کو ملک عرش بریں کے
احساں یہ انھیں پاؤں کے ہیں سر پہ زمیں کے

پہونچا عجب شکوہ سے رن میں وہ مہ جبیں　　کوسوں فروغِ حسن سے روشن ہوئی زمیں
آئے رسولِ حق یہ ہر اک کو ہوا یقیں　　غل تھا یہ نوجواں تو ہے یوسف سے بھی حسیں
تصویر سر سے تا بقدم مصطفیٰ کی ہے
اس حسن کے بشیر بھی ہیں قدرت خدا کی ہے

مثلِ کماں کشیدہ ہیں ابروئے بے نظیر　　ارجن بھی جس سے سہم کے ہو جائے گوشہ گیر
سر پہ نہ ہونے دیں گے عدو کو مژہ کے تیر　　ہیں اس کمان و تیر پہ قرباں جوان و پیر
قرباں چشم سرمہ کشیدہ کی شان پر
چلہ چڑھا ہوا ہے کیانی کمان پر

آنکھوں کو عین کعبہ سمجھتے ہیں حق پرست　　کیفیتِ رحیقِ محبت سے ہیں یہ مست
صانع نے کر دیا صفتِ مژگاں کا بند و بست　　عین الکمال سے انھیں پہونچے نہ تا شکست
مردم میں روشنی ہے اسی نورِ عین سے
دیکھے کوئی ان آنکھوں کو چشمِ حسینؑ سے

ہم شکل ہیں جنابِ رسالت مآب کے　　کہتا ہے حسن خود کہ نثار اس شباب کے

گیسو ہیں یا ہیں ماہ پہ ٹکڑے سحاب کے
رخسار ہیں کہ پھول کھلے ہیں گلاب کے
دونوں سے نور ہیں مہ و خورشید ماند ہیں
زلفیں گواہ ہیں کہ اندھیرے کے چاند ہیں

گلزار حسن سے کوئی دیکھے دہن کا رنگ
اڑتا ہے غنچہ دہن و یاسمن کا رنگ
شرمندہ ہے لبوں سے عقیق یمن کا رنگ
رنگیں بیاں ہیں سب سے جدا ہے سخن کا رنگ
بلبل بھی مدح خواں چمن مرتضیٰ کی ہے
غنچہ سے پھول جھڑتے ہیں قدرت خدا کی ہے

اللہ رے نور گوہر دندان آب دار -
بجلی چمک رہی ہے بدخشاں میں بار بار
الماس صدقے حاصل بحر عدن نثار -
ہیں گوہر خزینۂ محبوب کردگار
دولت ملی ہے اکبر شیریں مقال کو
ان موتیوں سے عشق ہے زہرا کے لال کو

ظاہر ہیں ان کے ہاتھوں کی زور آزمائیاں
مثل علی کرینگے صفوں کی صفائیاں
سرکی ہیں دم میں بدو احد کی لڑائیاں
زور ید اللہی سے بھری ہیں کلائیاں
بالا رہا ہے سب سے جہاں میں علیؑ کا ہاتھ
پہونچے یہ واں جہاں نہیں پہونچا کسی کا ہاتھ

کسطرح کوئی وصف سراپا کرے رقم
جلوہ خدا کے نور کا ہے سر سے تا قدم
قطرہ کہاں کہاں صفت قلزم کرم
مور ضعیف مدح سلیمان ذی حشم
یاں سب تعلیاں شعرا کی فضول ہیں
بس خاتمہ ہوا کہ شبیہ رسول ہیں

خالق جسے نبی سے بقدرت بنائے
خورشید کی کیا تاب جو آنکھ اس سے ملائے

یہ چاند سی تصویر کہاں سے کوئی لائے — خود ڈھونڈھے نظیر اپنا تو عالم میں نہ پائے
چہرہ گل شاداب ہے قد سرو سہی ہے
یوسف شہ والا کے عزیزوں میں یہی ہے

ہر شہر میں پیشانی انور کا ہے شہرا — سجدے کا نشاں بھی ہے تکلف ہے یہ دہرا
گویا ورق ماہ پہ ہے ماہ کا سہرا — دیکھو سر خورشید پہ طالع ہوا زہرا
اس طرح کا اختر کوئی دنیا میں نہ دیکھا
موسیٰ نے یہ جلوہ ید بیضا میں نہ دیکھا

غصے سے جو تیوری کو چڑھائے ہے یہ جرار — گویا کہ ہیں دو ناخن شیر ابروئے خدار
بے جنگ ہوئے جاتی ہے گھائل صف کفار — بلجاتے ہیں جس وقت تو چل جاتی ہے تلوار
اسطرح کا صفدر کوئی بستی میں نہیں ہے
یہ کاٹ کبھی تیغ دو دستی میں نہیں ہے

گردوں پہ مہ نو کا یہ عالم نہیں دیکھا — شمشیر ہلالی میں یہ دم خم نہیں دیکھا
دونوں میں کبھی فاصلہ اک دم نہیں دیکھا — یوں ربط کمانوں میں بھی باہم نہیں دیکھا
اک بیت کے یہ مصرع برجستہ ہیں دونوں
ظاہر ہیں کشیدہ ہیں پہ وابستہ ہیں دونوں

کہئیے مہ نو ان کو تو یہ رو نہیں اس میں — مہتاب کہیں رخ کو تو گیسو نہیں اس میں
ہے اک گل خورشید سو خوشبو نہیں اسمیں — آنکھیں نہیں پلکیں نہیں ابرو نہیں اس میں
بو ہے گل تر میں یہ خط و خال کہاں ہے
قد سرو کا موزوں ہے تو وہ چال کہاں ہے

آنکھوں کو تو دیکھو کہ عجب جلوہ گری ہے — ہاں دیدۂ نرگس کا بھی مضموں نظری ہے
حلقے میں سواد شب نور سحری ہے — یہ چشم میں پتلی ہے کہ شیشہ میں پری ہے

یہ شام و سحر حور و ملک نے نہیں دیکھی
آنکھ ایسی کبھی چشم فلک نے نہیں دیکھی

نظروں سے نہ کس طرح گرے دیدۂ آہو
بے لطف ہے جب تک کہ نہ ہو چشم نہ ابرو
آنکھوں سے نہاں ہے جو رخِ سیدۂ خوشخو
پتلی صفتِ قبلہ نما پھرتی ہے ہر سو
روتے ہیں فراقِ پسرِ شاہِ نجف سے
آنسو نہیں موتی نکل آتے ہیں صدف سے

خط ہی جو شبِ قدر تو رخ صبحِ ارم ہے
کیا قدرتِ حق ہے کہ شب و روز بہم ہے
توصیف میں عاجز دمِ تحریر قلم ہے
دیکھو خطِ ریحاں ورقِ زر پہ رقم ہے
پہلو میں سحر کو شبِ دیجور لیے ہے
ظلمات کو آغوش میں یا حور لیے ہے

یہ حسن کسی شب کی سحر نے نہیں پایا
یہ روئے دل افروز قمر نے نہیں پایا
رنگ لبِ نازک گلِ تر نے نہیں پایا
نور اس دُرِ دنداں کا گہر نے نہیں پایا
باہم تو ہیں دونوں کے مگر رنگ الگ ہیں
وہ لعل کے ٹکڑے ہیں یہ الماس کے نگ ہیں

خورشید رخ ان موتیوں کی آب میں دیکھے
ہیرے کی چمک اس دُرِ نایاب میں دیکھے
ایسے نہ کواکب شبِ مہتاب میں دیکھے
گردوں نے یہ تارے نہ کبھی خواب میں دیکھے
ٹھہرا جو نہ وہ لائقِ تشبیہ نظر میں
سوراخ اسی غم سے ہے موتی کے جگر میں

آئینہ کو حیراں کیا گردن کی صفا نے
ڈھالا ہے اسے نور کے سانچے میں خدا نے
الماس سے بازو ہیں تو مہتاب سے شانے
شانوں کو تو چوما ہے شہِ عقدہ کشا نے
قبضہ کبھی شمشیر نے ایسا نہیں پایا
اس طرح کا قبضہ نہ کسی شیر نے پایا

دستانے ہیں فانوس تو ہے شمع کلائی — یہ رستم دستاں نے بھی قوت نہیں پائی
منھ دیکھ لیں خود بھی یہ ہے ہتھیلی میں صفائی — اور ناخنِ انور کا ہنر عقدہ کشائی
بے تیغ کھنچے ہاتھ کا جوہر نہیں کھلتا
زور اُن کا بجز قلعۂ خیبر نہیں کھلتا

انوارِ الٰہی سے منور ہے یہ سینہ — مسکن ہے جہاں نور کا وہ گھر ہے یہ سینہ
ہم مرتبۂ سینۂ حیدر ہے یہ سینہ — عدل و کرم و داد کا مصدر ہے یہ سینہ
ہے عطر کی خوشبو کہ پسینہ ہے قبا میں
جزدان میں مصحف ہے کہ سینہ ہے قبا میں

اسکی کمرِ راست کا کیا حال کہوں آہ — خم ہو گئی مرجانے سے جسکے کمرِ شاہ
جس جا پہ ہو نقشِ قدم ابن یداللہ — ملنے سے وہ مثلِ خطِ قسمت ہے نہیں آگاہ
اُس خاک پہ کیوں رشک نہ ہو چرخِ بریں کو
گر زلزلہ آئے تو نہ جنبش ہو زمیں کو

گیسوے مسلسل رخِ روشن پہ جو ہیں چار — ہے اُن سے عیاں سلسلۂ احمدِ مختار
یہ مصحفِ رخسار کی سطریں ہیں نمودار — ہیں معنیِ پیچیدہ، کھلے گر نہ ہو طومار
زلفوں میں کرو غور ذرا رخ کی ضیا کو
دیکھو شبِ معراج میں محبوبِ خدا کو

چہرے کو اگر صبح کہیں زلف کو گر رات — دن ہوتا ہے جب خلق سے کرتی ہے سفر رات
دنیا میں سدا شام سے ہے تا بہ سحر رات — یاں بیچ میں خورشید ادھر رات ادھر رات
گیسوے رسا روے دل افروز بہم ہے
کیا قدرتِ حق ہے کہ شب و روز بہم ہے

دنیا میں کوئی آج نہیں ثانی اکبرؑ
یوسف کی زباں پر بھی ثنا خوانی اکبرؑ
یہ ماہ دو ہفتہ ہے کہ پیشانی اکبرؑ
خورشید ہے یا چہرۂ نورانی اکبرؑ

یہ جلوہ گری مہر کے پرتو میں نہیں ہے
ابرو میں جو خم ہے وہ مہ نو میں نہیں ہے

ابرو جو کماں ہے تو ہیں مژگان سیہ تیر
ہے جنکے ہر اک گوشہ پہ قرباں دل شبیر
ہے دیدہ و ابرو سے عیاں جنگ کی تصویر
دو مردم خونریز ہیں کھینچے ہوئے شمشیر

اب دیکھیں تو کون ملا سکتا ہے رن میں
الٹیں گی صفیں فوج کی اک چشم زدن میں

آغاز ہے سبزہ انھیں اٹھارھواں ہے سال
کس فصل میں اس گل کو خزاں کرتی ہے پامال
اک نور مجسم ہے نہ ہے حشمت و جلال
خورشید پہ نقطے ہیں کہ رخسار پہ ہیں خال

سیپارے ہوں اسپند جو سارے تو بجا ہے
تاروں کو فلک پہ اتارے تو بجا ہے

سبزہ رخ گلگوں پہ نکلنے نہیں پایا
یہ نخل ذرا پھولنے پھلنے نہیں پایا
موسم بھی لڑکپن کا بدلنے نہیں پایا
ہاتھوں میں غبار ماہ کی ملنے نہیں پایا

چہرے سے عیاں ہے نہ جوانی میں بھی کم ہے
دو سال ابھی عشرۂ ثانی میں بھی کم ہے

پستہ ہے کہ غنچہ ہے دہن عقل ہے یاں گم ہو
لالے کی کلی میں نہیں دیکھا یہ تبسم
دانتوں کی چمک دیکھ کے ہنگام تکلم
اشکوں کی طرح آنکھ سے گر جاتے ہیں انجم

تا بش میں جو دندان شکن برق ہو گئے ہیں
دریائے خجالت میں گہر غرق ہوتے ہیں

بے مثل ہے یہ گردن و بازو و بر و دوش
ساعد کی ضیا دیکھ کے موسیٰ کے اڑے ہیں ہوش

یہ انگلیاں روشن ہیں کہ شمعیں ہوئیں خاموش — ہے ضو سے ہتھیلی کی قمر ابر میں روپوش
ناخن نے دکھایا جو رخ جلوہ گر اپنا
شرما کے مہ نو نے جھکایا ہے سر اپنا

سینہ ہے وہ سینہ کہ جو کینے سے بری ہے — نور اس میں ہے یا آئینہ میں عکس پری ہے
کب قرص مہ و مہر میں یہ جلوہ گری ہے — یاں روشنی طور چراغ سحری ہے
دیکھے جو اسے علم کے گنجینے کو دیکھے
اس سینے کو جو دیکھے تو آئینے کو دیکھے

بے مثل ہے سینے کی طرح یہ شکم صاف — ہے صاف تو یہ بات کہ دشوار ہیں اوصاف
دیکھیں تو نظر بھر کے اسے صاحب انصاف — خورشید سے روشن ہے تو آئینہ سے شفاف
ضو ایسی نہ آئینۂ مہتاب میں دیکھی
مخمل نے یہ نرمی نہ کبھی خواب میں دیکھی

ہیں ان کے قدم راہ رو جادۂ تسلیم — ہاتھ آتے ہیں کب پاؤں کہ ہے عزت و تکریم
ان قدموں پہ جو سر ہو وہ ہے لائق تعظیم — ثابت قدمی ان سے سدا پاتی ہے تعلیم
روشن جو زمیں ہے تو یہ پرتو ہے انھیں کا
جو راہ خدا میں ہے وہ پیرو ہے انھیں کا

کہتا ہے کوئی چشم کو نرگس کوئی آہو — اسکی تو بصارت نہیں اسکی نہیں ابرو
چہرے کو کہا گر گل مہتاب ہے یہ رو — اسمیں نہ یہ سبزہ نہ یہ سرخی نہ یہ خوشبو
بے عیب ہے وہ اک پھول یہاں باغ لگا ہے
ہر چیز میں بس ایک اک داغ لگا ہے

دانتوں کو گہر مرثیہ گو کہتے ہیں سارے — بتلاؤ گہر خوب ہیں یا عرش کے تارے
یہ در نجف وہ ہیں علی کو ہیں جو پیارے — تاروں کو بھی صدقے فلک اوپر سے اتارے

کیا وصف کروں اُن کا سوا صل علی کے
گوہر نہیں قطرے ہیں سبب نور خدا کے

لب کو جو کہا لعل یہ مضمون ہے بیرنگ — اس مدح کے قابل نہیں ہے یہ دہن تنگ
بو مولب جاں بخش کا ہوتا ہے یہی ڈھنگ — اعجاز مسیحا کا دکھائے تو یہی رنگ
قدرت نہیں اس ہونٹوں کے اوصاف کی ہم میں
یہ وہ ہیں کہ مردوں کو جلا دیتے ہیں دم میں

قامت کو کہا سرو تو چال اسمیں کہاں ہے — یہ سیب ذقن یہ خط و خال اسمیں کہاں ہے
یہ حسن یہ صورت یہ جمال اسمیں کہاں ہے — یہ رعب یہ شوکت یہ جلال اسمیں کہاں ہے
گل ہو کہ ثمر بو نہیں یا بد مزگی ہے
ہر شے میں غرض ایک نہ اک شاخ لگی ہے

اک شور تھا کہ آج زمیں آسمان ہے — صحرائے کربلا نہیں دنیا کی جان ہے
اترا زمیں پہ چاند یہ خالق کی شان ہے — رضوان نے دی ندا کہ خدا مہربان ہے
پر تو ہے یہ رُخ خلف بوتراب کا
دیکھو الٹ گیا ہے ورق آفتاب کا

نقش سم فرس کی ضیا پر کرو خیال — اختر کہیں ہے بدر کہیں ہے کہیں ہلال
ہے دوپہر کے بعد سدا شمس کو زوال — یاں ہے وہی عروج نہ ہے حشمت و جلال
پروانہ آفتاب ہے چہرے کے نور پر
گھوڑے پہ آپ ہیں کہ تجلی ہے طور پر

آئینہ جبیں سے صفا آشکار ہے — ابرو سے ماہ رُخ سے ضیا آشکار ہے
چشم گہر فشاں سے حیا آشکار ہے — رُخ سے جلال شیر خدا آشکار ہے

رستم بھی چڑھ سکے گا نہ منھ پہ دلیر کے
چہرہ تو حور کا ہے پہ تیور ہیں شیر کے

نور جبیں نے جلوۂ قدرت دکھا دیا — چہرے نے حسنِ صبحِ صباحت دکھا دیا
ابرو نے رنگِ تیغِ شجاعت دکھا دیا — قامت نے سب کو طورِ قیامت دکھا دیا

جنگل کو بوئے کوچۂ گیسو بسا گئی
کپڑوں سے نکہتِ گلِ فردوس آ گئی

اعجاز لب میں چشم میں سحرِ حلال ہے — پتلی نہیں ہے چہرۂ یوسف کا خال ہے
تعریف کیا کروں کہ دہن بے مثال ہے — تقسیم جزو لا تیجزیٰ محال ہے

ٹھہرا لیا ہے نقطۂ فرضی دہن نہیں
اسرار کردگار ہیں جائے سخن نہیں

شیریں لبوں کی مدح میں اب ناطقہ ہے بند — لائیگا ہر سخن میں نمک یہ کہاں سے قند
پھیکی جو بات ہو وہ زباں کو نہیں پسند — عالم ہے ان کے شورِ تکلم سے بہرہ مند

نہ قند میں یہ لطف نہ شاخ نبات میں
صانع نے بھر دیا ہے مزا بات بات میں

بے مثل ہے جو شاذ دُرِ دنداں کی آب و تاب — دُرِ عدن کو دیتے ہیں دندان شکن جواب
یوسف نے دیکھے تھے یہی اختر میانِ خواب — طالع چمک گئے مہِ کنعاں بلا خطاب

باتو نہیں لب جو ہلتے ہیں اس خوش خصال کے
ہیرے کی چوٹ پڑتی ہے ٹکڑوں پہ لال کے

روشن گہر زمانہ ہے صبحِ گلو کا نور — دیکھے اگر تو شرم سے گردن جھکائے حور
نورِ خدا کا صاف گریباں سے ہے ظہور — پروانہ شمعِ حسن پہ جس کے چراغ طور
بوسوں کو حوریں رہ گئی ہیں ہونٹ چاٹ کے — پریوں نے جان دی ہے گلے کاٹ کاٹ کے

طاقت بھی انکے بازووں کا ایک نام ہے زوران کا خانہ زاد ۔ بہتوں غلام ہے
اقبال ان کے گھر کا مدار المہام ہے اُن کے جلو میں فتح و ظفر صبح و شام ہے
ہر دم قشون جاہ و حشم ساتھ رہتے ہیں
نصرت کو ان کی غاشیہ بردار کہتے ہیں

میر صاحب نے صناعت لفظی پر زیادہ توجہ نہیں کی۔ مراعات النظیر کی لیں ان کے کلام میں بعض جگہ پائی جاتی ہیں اسکو بھی وہ عیب سمجھتے تھے کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ "آپ رعایت لفظی کو پسند کرتے ہیں؟" تو ارشاد ہوا "کیا کروں لکھنؤ میں رہنا ہے" بعض شعرائے لکھنؤ نے بے نقط سلام اور مرثیے کہے تھے اس لیے میر صاحب کو بھی ایک مرثیہ میں چند بے نقط بند تصنیف فرمانا پڑے تاکہ نافہم یہ شک نہ کریں کہ ملک سخن کا خداوند صنائع لفظی کے استعمال سے عاجز ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:—

بے نقط

وہ طاہر وا طہر ہوا گر معرکہ آرا معلوم ہو حملہ اسد اللہ کا سارا
آگاہ ہو کس طرح کہو عمر کو مارا صمصام کا اک وار ہوا کس کو گوارا
اللہ۔ گر اک دم کو وہ صمصام علم ہو
ہر روح کو اُس دم ہوس ملک عدم ہو

سردار امم محرم اسرار محمدؐ مہر دل اسد اللہ کا دلدار محمدؐ
دلدار و دل آرام و مددگار محمدؐ ممدوح ملک مالک سرکار محمدؐ
سرور کہو اسلام کا اس مالک کل کو آرام دو اک دم دل سردار رسل کو

کس کا اسد اللہ سا ہو والد مرحوم حلاّلِ مہم مالک کل طاہر و معصوم
صدرِ دو سرا احمر دل سرور ہموم آسودہ ہو ہر سالک و گمراہ وہ محروم

معصوم کا دلدار ہو سالار اُمم ہو
اولاد کا اس عالم و عادل کو الم ہو

اس طرح کا والا ہمم اس طرح کا سردار اس طرح کا عالم کا ممد اور مددگار
وہ مصدر الہام احد محرم اسرار وہ اصل اصول کرم داور داورا

حاصل اگر اک مرد دل آگاہ کو مارا
مارا اگر اس کو اسد اللہ کو مارا

علامہ شبلی نے اپنے "موازنہ" میں کلام انیس پر ایسا مفصل تبصرہ کیا ہے کہ اس بحث پر زیادہ لکھنا ممکن نہیں۔ البتہ ادب کے لئے مفید ہوگا اگر اس موقع پر مشتے نمونہ از خروارے چند ایسے الفاظ و محاورات نقل کر دیے جاویں جن کے طرز استعمال میں میر صاحب جمہور سے اختلاف کرتے ہیں یہ مسلم ہے کہ وہ اہل دہلی کے خلاف "فکر" اور "سانس" کو ہمیشہ مؤنث نظم کرتے ہیں اور جگہ کو "جاگہ" بولتے ہیں لیکن اشعار مندرجہ ذیل سے ظاہر ہے کہ وہ بیگمات کی خاص زبان کو ترجیح دیتے ہیں اور استعمال فصحا کو قواعد کا پابند نہیں سمجھتے۔

ردّ و بدل (مؤنث)

وہ خود ہیں تو یہ سپر آہنیں میں تھی
اس دن غضب کی ردّ و بدل کفر و دیں میں تھی

حلق (مذکر)

آج احمد و حیدر کے گریبان پھٹیں گے اٹھارہ بنی فاطمہؑ کے حلق کٹیں گے

حرم ۔ ناموس (مذکر)

ناموس مصطفےٰ اُسے رد کا کیے کمال
لیکن رُکا کسی سے نہ ہرگز وہ خورد سال

ایضاً

ڈیوڑھی پہ جب ناقوں کو بٹھایا حرم اُترے
بچے لیئے ناموس امام اُمم اترے

تبرکات (واحد)

ہو نفع نہیں بہن ابھی فریاد و آہ کا
لاؤ تبرکات رسالت پناہ کا

قامت (مؤنث)

سر و شرمائے قد اس طرح کا قامت ایسی
اسد اللہ کی تصویر تھے صورت ایسی

مقال (مذکر)

بیبیوں سے کیا زینب نے جو رو کر یہ مقال
صفِ ماتم سے وہ گھبرا کے اٹھیں سب فی الحال

جھانجھ (مذکر)

سنکر دہل کا شور کلیجے دہلتے تھے
تھرا کے جھانجھ بھی کفِ افسوس ملتے تھے

چکا چوند (یعنی چکا چوند میں مبتلا)

ان چاند سے چہروں کا جو ہے عکس زمیں پر
خورشید چکا چوند ہے واں عرش بریں پر

والدہ صاحب (بجائے صاحبہ)

دونوں نے کہا جوڑ کے ہاتھوں کو یہ اک بار
اے والدہ صاحب یہ نہ فرمایئے زنہار

بغی (بجائے باغی)

تب اس لعیں نے چیں بجبیں ہو کے یہ کہا
حاکم سے جو بغی ہو مجھے اس سے کام کیا

خوشی ہونا (خوش ہونے کی جگہ)

مادر کے رُخِ پاک کو تکنے لگے اصغرؑ جھولے میں خوشی ہو کے ہمکنے لگے اصغرؑ

ایضاً اس مژدہ کو سنتے ہی خوشی ہو گئیں شیریں

باری (بجائے بار)

آتش میں صفِ لشکر ناری نظر آئی حملوں میں قیامت کی باری نظر آئی

شکریہ (بغیر تشدید پار)

فرماتے تھے ہر بار کہ جو مرضیِ باری گہ شکریہ کرتے تھے کبھی گریہ وزاری

اُتارا

فوج آئی ہر جلدی کرو ساحل سے کنارا ہو گا لب جو شام کے لشکر کا اُتارا

ہتو انسنا۔

ہتو انس کے تیغ و سپر اکبرؑ یہ پکارے کیا بکتے ہو بیہودہ سخن منھ پہ ہمارے

شمشیر اُگلنا

کس قہر سے دیکھا طرفِ لشکرِ بے پیر بل آگیا ابرو پہ اُگلنے لگے شمشیر

جُواگر ("جہ" زائد)

خادم شہِ دیں کے ہیں تو عباس علی ہیں
اس عہدہ کے لائق جواگر ہیں تو وہی ہیں

سجائی (سجاوٹ کی جگہ) ع چہرہ کی سجاوٹ سے قبا چست ہے تن کی

گودی (گود کی جگہ) ع گودی میں گئی باپ کی گھبرا کے وہ بے آس

نگردوں (بسکون میم) ع نگردوں کو کسو گلشن جنت کے سفر پہ

رُندھنا (افسردہ و دلگیر ہونا)

کرتی تھی بیاں زوجہ مسلم یہی پیہم کیا ہو کہ رُندھی جاتی ہوں گھٹتا ہے مرا دم

خشکیدہ (سوکھی)

ع خشکیدہ زبانوں پہ سخن شکر کا جاری

گھمسان کرنا۔

جس صف پہ چمک کر گری گھمسان کر آئی
جمعیت اعدا کو پریشان کر آئی

دل رُندھ جانا۔

دل رُندھ گئے تھے تیر گئے دشت بلا سے
روتے تھے حرم خیمہ میں بیٹھے ہوئے پیاسے

ذَر (بمعنی غالب)

طینت میں وفا رُخ پہ شجاعت کے اثر تھے
گنتی میں بہتر تھے مگر لاکھ پہ ذر تھے

شمشیر کرنا (یعنی تلوار چلانا)

میں مرا جاتا ہوں لِلّٰہ نہ شمشیر کرو
بخشوانے کی گنہگاروں کی تدبیر کرو

زر بھر۔

زر بھر تمام ہو گئی وہ شام کی سپاہ
پہونچا پچھاڑیں لپسرِ ضیغمِ الٰہ

فرق (بمعنی روک۔ بندش۔ مناہی)

پانی کا فرق خاص ہے تجھ دل فگار پر
کھائے گا گیا نہ کوئی ترس شیر خوار پر

کا ہیکا۔

پیاسے ہیں تین دن سے امام فلک وقار
کا ہے کا ہے یہ خوف بڑھو بھر کا زار

حق بطرف۔

شہ کا تو حق بطرف ہے کہ ہے بھائی ایسا
حسن سے جسکے منور ہوا میدانِ غزا

گھنیری (گھنی جگہ)

دال یہ گرد ہوں جہاں چھاؤں گھنیری ہووے
عمر بھر گر ابھیں دیکھیں تو نہ سیری ہووے

نراسا (بمعنی مایوس)

اسراف سے وہ پریشان نراسے بھی بڑھے نیچے نول کے عیدر کے نراسے بھی بڑھے

کُلّھم۔

سب آز موہ کار تو ی تن. جوان ہیں اور کُلّھم ادھر تو بہتر. جوان ہیں

بکنی۔

بکتی تھی بس اسی کی ہماری سپاہ میں پہلے شہید ہوگا یہی حق کی راہ میں

علامہ شبلی نے "موازنہ" میں اپنا خیال ظاہر کیا ہے کہ "بکتی" اراذل و انفار کی زبان ہے لیکن محلات شاہی میں یہ لفظ برابر استعمال کیا جاتا تھا۔ اور لکھنؤ کی شریف زادیاں ہنوز اس لفظ کو بے تکلف بولتی ہیں۔ میر انیس نے یہ لفظ مختلف موقعوں پر استعمال کیا ہے اور میر صاحب کا کسی لفظ کے نظم کرنے پر اصرار کرنا اس کی فصاحت کی کافی دلیل ہے بقول بحر لکھنوی ؎

بیرونیوں کو چاہیئے تقلید لکھنؤ

ہم خود سند ہیں ہم کو سند کیا ضرور ہے

ناظرین کتاب یہ نکتہ فراموش نہ کریں کہ میر انیس کا کلام تقریباً نصف صدی کی زبان کا مجموعہ ہے بعض الفاظ و محاورات جو ان کی نوعمری میں مستعمل تھے پختہ مشقی کے دور تک باقی نہ رہے اور ان کی پیرانہ سالی میں زبان اُردو بہت صاف و شستہ ہو چکی تھی۔

ابتدائی کلام میں بہت سے ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کو آخر زمانہ میں انھوں نے ترک کر دیا تھا۔ علاوہ اس کے ان کے مطبوعہ کلیات میں اغلاط کتابت اور تحریفات کو بھی کافی دخل ہے۔ اس لئے

جب تک کوئی انوکھا محاورہ کلیات میں متعدد مقامات پر نہ دیکھا جائے اور آخری زمانہ کے کلام میں بھی نہ پایا جائے بطور سند کے نہیں پیش کیا جا سکتا۔

عرصہ ہوا مولوی عبدالغفور نسّاخ نے ایک رسالہ میر انیس اور مرزا دبیر کے متعلق لکھا تھا اور میر صاحب کے کلام پر بعض اعتراضات بڑے زور شور سے کئے تھے لیکن ان میں سے بیشتر کی بنیاد یہ غلط فہمی تھی کہ اُنھوں نے کتابت کی غلطیوں کو میر صاحب کی طرف منسوب کیا۔

مثلاً میر صاحب کا ایک مصرع ہے "بیوہ ہوئی اک رات کی بیاہی ہوئی دختر" یہ کلیات میں اس طرح چھپا "رانڈ ہوتی ہے اک رات کی بیاہی ہوئی دختر"۔ نسّاخ کو اعتراض کا موقع ملا کہ حروف تقطیع میں گرتے ہیں!! یا میر صاحب نے فرمایا تھا "ہو مغفرت خلیق کی یا خالق الانام"۔ کلیات میں شائع ہوا "ہو مغفرت خلیق کی یا رب ذوالکرام" اور معترض کو یہ لکھنے کا موقع ملا کہ "ذوالکرام" مہمل لفظ ہے۔

سب سے بڑھ کر ستم یہ کہ میر صاحب کا مصرعۂ ذیل

اُترا یہ سخن کہہ کے وہ کونین کا والی

کلیات میں اس طرح چھپ گیا۔

اُترا یہ سخن کہہ کے وہ کونین کا عالی

"واو" کی جگہ "عین" نے لی اور معترض کو طومار اغلاط میں ایک نمبر بڑھانے کے لئے روشنائی ہاتھ آئی۔ اعتراض جڑ دیا کہ "کونین کا عالی" غلط ہے!!!

اسی قسم کے بے بنیاد اعتراضات مرزا دبیر کے کلام پر بھی کیئے گئے تھے مگر بعد کو ان کے ایک قدر شناس نے "دفتر ماتم" کانی صحت واہتمام سے شایع کیا اور معترض کی زبان بند کردی۔ افسوس ہے میر صاحب کا کلیات ہنوز اغلاط کتابت سے صاف نہیں ہوا۔ حال میں نظامی پریس بدایوں سے جو ایک جدید اڈیشن کلیات کا بڑی آب وتاب سے شایع کیا گیا ہے اس میں بھی وہ تمام غلطیاں دور نہیں کی گئیں جن کی طرف مرزا محمد رضا متخلص بہ معجز نے تطہیر الاوساخ میں اشارہ کیا تھا۔ یہ کتاب اعتراضات لساخ کے جواب میں شعلہ طور کانپور سے ۱۲۹۶ھ میں شایع ہوئی تھی اور اب کمیاب ہے چند روز میں یہ مفید رسالہ تلاش سے بھی نہ ملے گا۔ اور آئندہ نسل سمجھے گی کہ میر انیس نے واقعی "رب ذوالکرام" ہی نظم کیا ہوگا۔ نظامی پریس نے وفاداری سلطنت کے جوش میں میر صاحب کے کلام پر اصلاح دینے میں بھی تامل نہیں کیا ہے۔ انتزاع سلطنت اودھ سے دل شکستہ ہوکر میر صاحب نے ایک رباعی کہی تھی جس کا پہلا شعر ہے ؎

کیونکر دل غمزدہ نہ فریاد کرے   جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے

غنیم کا لفظ نظامی پریس کو ناگوار ہے اسلئے یوں اصلاح دی جاتی ہے۔

کیونکر دل غمزدہ نہ فریاد کرے   جب ملک کو چرخ پیر برباد کرے

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔

المختصر میر انیس سادگی بیان۔ شیرینی زبان۔ صفائی روزمرہ۔ خوبی بندش میں بے مثل اور مصوری واقعہ نگاری میں لاجواب اور حفظ مراتب میں بے نظیر تھے۔ نازک خیالی اُن کا حصہ تھا اور کشش تاثیر سے

تو شاید ہی کوئی بند اُن کا خالی ہوتا ہو۔

انگلستان کے مشہور سخن سنج ملٹن نے کہا تھا کہ "بہترین نظم وہ ہے جس میں سادگی نازک خیالی اور تاثیر ہو" یہ تمام اوصاف اس خوبی سے کلام انیس میں خود بخود جمع ہو گئے ہیں کہ ایک ظریف کے قول کے مطابق ملٹن کے مقولہ کو زمانۂ حال میں یوں ترمیم کرنا چاہیئے کہ "بہترین نظم وہ ہے جو جناب انیس کی زبان مبارک سے نکلی ہو"

اُن کا پاکیزہ کلام بہترین اصناف سخن کا جامع ہے۔ اس میں ڈراما بھی ہے اور ایپک بھی۔ تشبیب غزل ہے اور رباعی مسدّس بھی۔ واقعہ نگاری اور اظہار جذبات بھی۔ بلاغت کا انداز ہے اور فصاحت بھی استعارات اور تشبیہات ہیں اور صنائع و بدائع بھی۔ مناظر قدرت کے فوٹو ہیں اور خیال آفرینی بھی۔ فخر و خود ستائی ہے اور عجز و انکسار بھی۔ رزم بزم ہے اور اصلاح اخلاق بھی۔ محاورہ بندی روزمرّہ ہے اور توازن و تناسب الفاظ بھی۔

مولانا حالی نے خوب کہا ہے:۔

اُردو کو رواج چار سو تیرا ہے ۔۔۔ شہروں میں رواج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن باقی ہے ۔۔۔ تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

خاتمہ

یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر ۔۔۔ اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر ۔۔۔ گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

اس باغ میں چشمے ہیں ترے فیض کے جاری ‏ ‏ بلبل کی زباں پر ہو تری شکر گزاری
ہر نخل برومند ہے یا حضرتِ باری ‏ ‏ پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری

وہ گل ہوں عنایت چمنِ طبعِ نکو کو
بلبل نے بھی سونگھا نہ ہو جن پھولوں کی بو کو

بندۂ ناچیز نے مختلف کیاریوں سے پھول چن کر گلدستہ بنایا اور شہسواران اقلیم فصاحت کی سرکار میں نذر کرنے کو لے چلا۔ غمازوں نے پردہ دری کی ؎

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہے
آنکھ نرگس کی دہن غنچہ کا حیرت میری

کلیاں اشہری کے گلزار سے چنیں۔ گلہائے شگفتہ احسن کے لالہ زار سے توڑے۔ پتیاں ثابت کے سدا بہار سے لیں۔ بندش شبلی کے مرغزار سے اڑائی۔ سوت کا ڈورا لے کر یوسف کی خریداری کو جاتا ہے ہاتف غیب نے آواز دی کہ ؎

حاسد کا دل جلے نہ تو ارد کے داغ سے
روشن چراغ ہوتے ہیں سو اک چراغ سے

سادہ کار دوسرے کی انگوٹھی پر نگینہ جڑتا ہے اور انعام پاتا ہے۔ ساقی پیر مغاں کی شراب اندازہ سے پلاتا ہے اور دعائیں لیتا ہے۔ مرقع ساز پرانی تصویر چوکھٹے میں سجاتا اور صناع کہلاتا ہے۔ باغباں روشوں کو جھاڑ جھنکار سے صاف کرتا۔ پھول پتی کے خوبصورت چمن جدا جدا بناتا سرو شمشاد کے پودے مختلف مقامات سے لاکر قرینہ قرینہ سے لگاتا اور تمغۂ امتیاز پاتا ہے۔ سلیقہ شعار سکریٹری ڈرائنگ روم کے دروازوں پر

گوہر نگار پردے آویزاں کراتا۔ دیواروں پر نقش و نگار بنواتا۔ کمرے کو جھاڑ و فانوس کنول سے دُلھن بنا دیتا ہے اور خطاب پاتا ہے۔

کیا عجب ہے کہ حضرت ممدوح کے فیض نسبت سے خارِ خطاب، پر صادِ صواب کا دامن سایہ گستر ہو اور آبِ قبول کے چھینٹوں سے مرجھائے ہوئے پھولوں میں وہ مہک پیدا ہو کہ ان کی خوشبو مدّت تک قدر شناسوں کے دماغ کو طبلۂ عطار بنائے رکھے۔

غارتِ بُت خانۂ چیں کردہ ام
تا صنمے چند گزیں کردہ ام

۱۵/ اگست ۱۹۲۵ء

امیر احمد علوی منیجر چھاؤنی

۲۲ محرم الحرام ۱۳۴۴ھ

Ashraf Hussain



Ashraf Hussain